ماہنامہ مجلہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

JULY --- 1989

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ مجلہ

حیاتِ نو

جلد ۳ ——————— شمارہ ۶

جولائی ۱۹۸۹ء

• مدیر مسئول ——— نور محمد فلاحی

• مرتب ——— ولی اللہ سعیدی فلاحی

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

• سالانہ زرِ تعاون .... ۳۰ روپے

• خصوصی معاون .... ۱۰۰ روپے

• غیر ممالک سے .... ۳۰ امریکی ڈالر

• فی شمارہ .... ۳ روپے

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ مجلہ "حیاتِ نو" جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ، یوپی ۲۷۶۱۲۱

نقش نعمی پرنٹرس بڑے جال پریس دہلی ٭ کاتب: رفیق محمد شاہ پور، کندھرا پور، اعظم گڑھ

نقوشِ حیاتِ نو

اداریہ

طاقتِ مسلم	محمد اسمٰعیل فلاحی	۳

بحث و نظر

حدیث کے غث و سمین میں امتیاز کے اصول	مولانا امین احسن اصلاحی	۹
تحریکِ خلافت اور مولانا ابو الکلام آزاد	عبد الحی فاروق فلاحی	۲۳
علم ریاضی میں عربوں کی خدمات ایک مختصر جائزہ	ڈاکٹر ارشد حسین بھو چیدری	۲۸

استفتاء

تراویح میں ترجمۂ قرآن		۳۹

شعر و نغمہ

غزل	مجاہد الحکیم چودی	۴۴

روحِ انتخاب

تذکیر	سید حامد علی	۴۶

جامعہ کے لیل و نہار

خطاب امیر حلقہ یوپی		۵۲
نائب ناظم جامعہ سفر حج پر		۶۰

اداریہ

محمد اسمٰعیل فلاحی

طاقتِ مسلم

حلقۂ ادب اسلامی کے روحِ رواں انور اعظمی مرحوم، تحریک اسلامی ہند کے ممتاز اور جانے پہچانے شاعر تھے۔ ان کی شاعری اسلامی ادب کی ترجمانی اور آئینہ دار تھی۔ انھوں نے "طاقتِ مسلم" کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے جس میں ہماری تاریخ کے ایک دردناک باب کو بڑے مؤثر دل پذیر اور دل کو چھو لینے والے انداز میں قلمبند کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

ابھی دوسری صدی ہجری کی ابتدا تھی۔ یزید بن عبدالملک کا زمانہ تھا۔ معمورۂ ارضی کے ایک بڑے حصہ پر اسلامی حکومت قائم تھی۔ ملکوتی صفات صحابۂ کرام کو اس دنیا سے گزرے زیادہ دم نہیں گزرا تھا۔ اللہ سے محبت کرنے والے، اللہ سے ڈرنے والے اور اللہ ہی پر بھروسہ کرنے والے اپنے پرائے ہر ایک کے خیر خواہ، ساری مخلوق کو اللہ کا کنبہ سمجھنے اور ہر ایک سے ٹوٹ کر پیار کرنے والے راست باز، امانت دار، عہد و پیمان کے پابند، ایثار پیشہ، قناعت پسند، برائی کے خلاف برسرِ جنگ، ظلم کے خلاف ننگی تلوار، جن کی ملک گیری و کشور کشائی اپنے لیے نہیں، اللہ کی رضا کی خاطر اور بندوں کی بھلائی کے لیے، جن کی بے لوثی اور بے نفسی کا یہ عالم کہ عین میدانِ جنگ میں جب کہ دشمن چت ہو پچھاڑا جا چکا ہے، صرف وار کرنا باقی ہے، وہ خبثِ باطن کا مظاہرہ کرتے ہوئے چہرۂ مبارک پر تھوک دیتا ہے، اس کے اوپر سے اتر آتے ہیں کہ پہلے تو صرف خدا کی خوشنودی مطلوب تھی اور اب اس میں اپنے نفس کا حصہ بھی شامل ہے۔ دنیا نے ان کے قدموں میں اپنے سر جھکا دیے، دل ڈال دیے تھے، جہاں ان کے رعب و دبدبہ کا یہ حال تھا کہ دل سینوں میں کانپنے لگتے تھے وہیں ان سے محبت کا یہ عالم کہ دل بے تابانہ ان کی طرف کھنچے تھے۔

لیکن دوسری صدی کے آتے آتے ان اوصاف میں نمایاں فرق محسوس کیا جانے لگا تھا۔ گرچہ اسلامی حکومت قائم تھی بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ اقتدار وسیع تھا اور دولت کی ریل پیل پہلے سے بڑھ کر تھی۔ اسلامی قوتیں عددی اور مادی دونوں پہلوؤں سے پہلے سے فائق اور برتر تھیں۔

لیکن اس سب کے باوجود وہ قلندرانہ صفات آہستہ آہستہ غائب ہو رہی تھیں۔ یقینِ محکم، عملِ پیہم اور محبت فاتح عالم کی تصویر دھندلی پڑنے لگی تھی۔

صورتِ حال کی اس تبدیلی سے لوگوں نے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ افغانستان کے فرماں روا رتبیل نے جو اسلامی حکومت کو جزیہ دیا کرتا تھا، جزیہ دینے سے انکار کر دیا۔ ظاہر ہے معاملہ حکومتِ اسلامیہ کے لئے نازک اور سنگین تھا۔ غرض فتوحات اور تن آسانی کی وجہ سے جسم پھولے ہوئے تھے لیکن بازوؤں میں پہلے کا سا دم خم باقی نہیں تھا۔ اقبال کو لیتی کا گھن لگ چکا تھا۔ مقابلہ اور ٹکر کی تاب باقی نہیں تھی۔
ایک وفد شاہانہ کروفر کے ساتھ رتبیل کے دربار میں پہنچتا ہے، ریشمی لباس میں ملبوس، چہروں سے تن آسانی ظاہر، شروع میں افہام و تفہیم اور پرچانے کا انداز رہتا ہے لیکن آخر میں وفد کی طرف سے دھمکی کا لب و لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ:

ہاں اگر سوچ سمجھ کر اٹھایا ہے یہ قدم — تو ابھی تازہ ہیں وہ بازوئے کہسار شکن
جن کی شمشیر ہلاکت کے ہیں قائل اب تک — روم و ایران کے کہسار و بیابان و چمن

رتبیل اس ساری گفتگو کو خصوصاً اس دھمکی کو پورے اطمینان اور نہایت شانِ بے نیازی سے سنتا ہے اور اس پر دھمکی کا ذرہ برابر بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ پوچھتا ہے وہ لوگ کہاں گئے جن کے آگے ہم نے گھٹنے ٹیکے اور جنھیں جزیہ دینا منظور کیا تھا۔ تمہارے پاس آرائش و زیبائش کے لئے وقت کہاں؟ اپنا پیٹ بھرنے سے پہلے پڑوسی کی فکر کرنے والے، خود پینے سے پہلے ساتھی کو پلانے والے، لوٹنے کے بجائے حفاظت کرنے والے، دوستوں کے سامنے بچھے رہنے والے، سوکھے ٹکڑوں پر گزارہ کر لینے والے، جذبۂ جہاد سے سرشار، انھیں اس بات کا موقع کہاں کہ وہ لذتِ کام و دہن کی طرف توجہ دیں۔ تمہاری طرح سے گرچہ وہ موٹے اور فربہ نہیں تھے لیکن ان کے بازوؤں میں وہ فولادی قوت اور ان کے ارادوں میں وہ بجلی کی توانائی تھی کہ جس سے پہاڑوں کے دل لرز جایا کرتے تھے، چہروں پر تمہاری طرح رنگ و روغن کے بجائے عین عالمِ جوانی میں ان کے چہروں پر جھریاں پڑ گئی تھیں لیکن:

پھر بھی تم لوگوں سے وہ لوگ کہیں تھے بہتر — گو میسر نہ تھے ان کو ترے ملبوس و بدن
ان کی آنکھوں میں تڑپتی تھی وہ برقِ بے کل — تھرتھرا اٹھتے تھے جس سے دلِ کہسار و چمن

ان کی ہر بات میں ہے آگ محبت کی جھلک — ان کے ہر کام میں ہے پاک صداقت کی چبھن
وہ کرم بار، وفا کیش، غیور و خوددار — عہد و پیمان کے وہ پابند تھے، تم عہد شکن
مجھ کو دھمکی نہ دو، گر رُخ بھی ادھر تم نے کیا — پیس ڈالیں گے تمہیں یہ مرے کہسار و دمن

وفد کے پاس اس دھمکی کے جواب میں کچھ نہ تھا صرف باتیں تھیں۔ طاقت ایمان و عمل سے پیدا ہوتی ہے اور اسے پہلے ہی گھن لگ چکا تھا۔ عددی قوت اور مادی وسائل کی برتری اس کی تلافی نہیں کر سکتی۔ نتیجہ ظاہر ہے، وفد کے لوگ ناکام و نامراد واپس ہوئے۔

فیصلہ آج بھی کر سکتے ہیں اربابِ نظر — قوتِ بازوئے مسلم کا کہاں ہے مخزن

لسانی، تہذیبی، علاقائی جھگڑے، اخلاقی بحران، لاقانونیت میں اضافہ، بڑھتی مہنگائی، تعلیمی اداروں میں ابتری، رشوت کی گرم بازاری، غرض زندگی کے ہر شعبہ میں فساد۔ یہ ہے ملک کی صورتحال۔ اور ملک کے شہری ہونے کے ناطے ہم بھی ان سے دوچار ہیں لیکن ہمارے لئے فرقہ وارانہ فسادات، منہدم مساجد، مسلم پرسنل لا، اردو، سرکاری ملازمتوں اور سکیورٹی فورسوں میں مسلمانوں کی نمائندگی اور مخلوط تعلیمی اداروں کے مسائل زیادہ وجہ تشویش ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ سنگین مسئلہ تہذیبی تشخص کا مسئلہ ہے کہ ہم اور ہماری آئندہ نسلیں کیسے مسلمان کی حیثیت سے باقی رہیں۔
ہماری پوری قیادت پریشان ہے۔ آگ بجھتی نہیں، مسائل حل ہوتے نہیں، ڈور الجھتی جاتی ہے، قائدین گھبرا کر کبھی کسی بیساکھی کا سہارا لینا چاہتے ہیں تو کبھی یہ حل سمجھ میں آتا ہے کہ کوئی سیاسی پارٹی ہی ہمارے دکھوں کا مداوا ہے حالانکہ دونوں کا انجام معلوم ہے۔ خالص مسلم سیاسی پارٹیاں پہلے سے موجود ہیں اور مسلمان ایک زمانہ سے مختلف سیاسی پارٹیوں کا سہارا لیتے آئے ہیں، کبھی کسی پارٹی کا پرچم بلند کیا، کبھی کسی کے جھنڈے تلے جمع ہوئے لیکن کیا ان سے مسائل حل ہو گئے؟ گتھیاں سلجھ گئیں؟ کبھی کبھار ملازمتوں یا وزارتوں کا حصول اور وقتاً فوقتاً بعض مراعات دینے کا اعلان، یہ سب بہلانے اور پھسلانے کے ہتھکنڈے ہیں۔ ان سے بیوقوف بنایا جاتا رہتا ہے اور کبھی کبھی تو کوئی ڈور اس لئے الجھا دی جاتی اور کوئی مسئلہ اس لئے پیدا کر دیا جاتا ہے کہ اس کی کوئی گرہ کھول کر یا اس کے کسی جزء کو حل کر کے سادہ لوحوں کو خوش کیا جائے۔

طاقتور اپنا کام کر جاتا ہے اور کمزور چیخ چلا کر، آہ و فغاں اور فریاد و ماتم کر کے خاموش ہو جاتا اور اپنے کو تسلی دے لیتا ہے۔ یاد رکھئے! یہ کنونشن، جلوس و مظاہرے، قرار دادیں، اور بیانات کمزور قوموں کا شیوہ اور چیخ و پکار کے سوا کچھ نہیں۔ جب تک آپ کے بازو قوت سے محروم رہیں گے نعرے کچھ کام نہیں دیں گے۔ سیاسی پارٹیاں بنا کر آپ نے دیکھ لیا۔ بیساکھیوں کے سہارے کا حال آپکو معلوم ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ حقوق بھیک مانگنے سے نہیں ملا کرتے اور صحیح بات یہ ہے کہ آپ اس دنیا میں حقوق دینے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، مانگنے کے لئے نہیں۔ آپ کو اس مقام پر اور اس موقف میں ہونا چاہئے کہ آپ لوگوں کے درمیان انصاف کر سکیں، دوسروں کو ان کے حقوق دے سکیں۔ ہم ساری تدبیریں کرتے ہیں لیکن تدبیریں کارگر نہیں ہوتیں! اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ ہماری نگاہ بنیادی نقص کی طرف نہیں جاتی، ہر طاقت کے اصل سرچشمہ ایمان کی فکر نہیں کرتے، اس کے منافی اور اس سے میل نہ کھانے والی چیزوں کو اپنی زندگیوں سے کھرچ کر نہیں نکالتے، خدا پر، اس کی ذات و صفات پر، اس کے وعدوں اور وعیدوں پر، اس کے رسولوں اور اس کی کتابوں پر اور آخرت کے دن پر کامل و پختہ یقین، اس پر توکل و بھروسہ، اسی سے محبت اور اسی کا خوف اور اسی ایمان و یقین کے مطابق اپنی زندگیوں کی اصلاح، دو دنیا کو اسی ایمان و اخلاص اور اصلاح احوال کی دعوت اور اللہ کی ہر مخلوق سے پیار و ہمدردی، در اصل مومن کا یہی ایمان، اس کی طاقت کا اصل منبع و سرچشمہ ہے۔ یہی وہ نسخہ ہے جس سے بیمار قوموں نے شفا پائی ہے اور یہی ہمارے مرض کہن کا واحد چارہ ہے۔ اس نسخہ پر عمل کئے بغیر ہم ہزار سال تک سر مارتے رہیں، بحیثیت مسلم ہمارا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ عزت و سربلندی عددی و مادی برتری کی مرہون منت نہیں ہوا کرتی۔ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ (سورۃ بقرہ ۲۴۹) "کتنی چھوٹی جماعتیں ہیں جو اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آگئی ہیں۔ اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہوتا ہے۔"

مولانا حبیب اللہ صاحب مرحوم تحریک اسلامی ہند کے ایک اچھے عالم دین تھے۔ موصوف ضلع بستی کے رہنے والے اور ادھر عرصے سے لکھنؤ میں مقیم تھے۔ تحریکی زندگی کا آغاز

جمعیۃ العلماء کے پلیٹ فارم سے ہوا اور حق کی پیاس جماعت اسلامی میں شمولیت کے بعد بجھی۔ ۱۰ر جولائی ۱۹۹۹ء کو مولانا کے انتقال سے تحریک اسلامی ہند کو ایک زبردست دھچکا لگا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی غلطیوں کو معاف فرمائے، خدمات قبول کرے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔

مولانا کا جامعہ سے بڑا گہرا اور قریبی تعلق رہا ہے۔ وہ آخر عمر تک اس کی مجلس تاسیسی کے رکن بھی رہے ہیں۔ مولانا کا جامعہ سے تعلق اس کے جامعہ بننے سے بہت پہلے کا ہے۔ یہ ۱۹۶۰ء کی بات ہے جب جامعۃ الفلاح ایک چھوٹے مکتب کی شکل میں تھا اس وقت تحریک اسلامی کے جن افراد کے ذہنوں میں اس مکتب کو جدید و قدیم کی حامل ایک بڑی درسگاہ اور تحریکی ادارہ کی شکل دینے کا خیال آیا ان میں ملک مولانا حبیب اللہ مرحوم کا نام نمایاں لوگوں میں تھا۔ ان دنوں موصوف جماعت اسلامی ہند مشرقی یوپی کے امیر حلقہ تھے۔ بلریا گنج اکثر آنا جانا ہوتا تھا۔ مولانا اس نوخیز ادارے اور اس نوزائیدہ چمن کے بنانے، سنوارنے اور اس کی تعمیر و ترقی میں خاصی دلچسپی لیتے، جامعہ تشریف لاتے، اساتذہ کرام سے ملتے، نشستیں ہوتیں، یہاں کے حالات سے باخبر ہوتے، انھیں مناسب حال مشورے دیتے۔ اب مولانا اس دنیا میں نہیں رہے لیکن جب تک یہ جامعہ رہے گا مولانا کی یاد آیا کرے گی۔ جامعہ سے مولانا مرحوم کا یہ تعلق صرف فکری نہیں تھا بلکہ آپ ہی کی ترغیب و تشویق سے آپ کے اعزہ و اقارب کی ایک بڑی تعداد نے جامعہ سے استفادہ کیا اور خود مولانا کے بڑے فرزند ملک حبیب احمد صاحب فلاحی جامعۃ الفلاح سے فارغ ہونے والے پہلے گروپ میں تھے۔ دوسرے فرزند عبد المجید جمالی صاحب جامعۃ الفلاح میں میرے کلاس فیلو رہے۔ اور تیسرے فرزند شعیب جمالی صاحب نے بھی چند سال جامعہ میں گزارے۔ اللہ تعالیٰ انھیں، ان کی والدہ، بہنوں اور دیگر پسماندگان کو صبر کی توفیق دے۔

جامعہ میں مرحوم کی یاد میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا جس میں صدر جامعہ مولانا عبد الحسیب صاحب اصلاحی، مولانا ابوبکر صاحب اصلاحی، ماسٹر جنید احمد صاحب، مولانا صغیر احسن صاحب اصلاحی اور مولانا شبیر انور صاحب اصلاحی فلاحی نے مرحوم کو بہترین خراج عقیدت پیش کیا۔ صدر جامعہ نے مرحوم کو بڑا نیک، اللہ والا، دل دردمند کا مالک اور جامعہ کے مسائل میں گہری دلچسپی لینے والا بتایا۔ مولانا ابوبکر صاحب اصلاحی نے انھیں

صاف ذہن، صاف دل، صاف زبان اور صحیح معنوں میں حق کا متلاشی قرار دیا۔

مولانا ابوبکر صاحب اصلاحی مرحوم کے ساتھ ایک عرصہ تک جماعت کے ذمہ دار کی حیثیت سے رہے ہیں۔ مولانا نے ان کے سلسلہ میں تعزیتی اجلاس میں جو کچھ اظہار خیال فرمایا ان ہی کے قلم سے آئندہ شمارہ میں نذر قارئین کیا جائے گا۔

"حیاتِ نو" کے ساتھ پریس والوں کی کرم فرمائیاں معلوم ہیں، ادھر بعض دوسری مجبوریوں بلکہ رکاوٹوں کی وجہ سے ہم وقت پر جولائی کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں نہیں پہنچا سکے ہیں جس کا ہمیں افسوس ہے۔ اللہ سے دعا کریں کہ ہم ان پریشانیوں پر جلد ہی قابو پا سکیں تاکہ پرچہ وقت پر ملے اور آپ کو غیر معمولی انتظار کی زحمت نہ برداشت کرنی پڑے۔

ہر ماہ "حیاتِ نو" کے بہت سے پرچے پتہ کے نقص یا کسی نامعلوم سبب سے واپس آجاتے ہیں۔ جن خریداروں یا اعزازی ممبروں کو "حیاتِ نو" نہ مل پا رہا ہو، براہ کرم وہ خریداری نمبر کے ساتھ اپنا پتہ مکمل اور صاف صاف لکھ کر ہمیں بھیج دیں۔ ہم مطلوبہ پرچے ان کی خدمت میں بھیجنے کی کوشش کریں گے۔ ••

بقیہ: روح انتخاب

اور زندگی کے دوسرے معاملات میں یہ اسپرٹ پیدا کر سکتا ہے۔ نماز کے اندر جو اذکار نبی صلعم سے منقول ہیں ان کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نماز میں کس قدر اس کی روح پیدا کرنا مطلوب ہے۔ احتساب بھی ایک ضروری چیز ہے یعنی اس بات کا ہر وقت شعور رہے کہ ہم نے ابھی جو نماز پڑھی ہے وہ اثر اندازی کے اعتبار سے کیا حیثیت رکھتی ہے۔ خدا کا ارشاد ہے کہ نماز برائیوں سے روکتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کو برائیوں سے روکنے میں کتنا دخل ہے لہٰذا اگر نماز پڑھنے کے باوجود آدمی برائیوں و بے حیائیوں سے نہ بچ سکے تو اس کا صاف و سیدھا مطلب یہ ہے کہ نماز ہی میں کوئی خلل اور خرابی ہے۔ ••

حدیث کے غث و ثمین میں امتیاز کے اصول

امام امین احسن اصلاحی

حدیث کے غث و ثمین میں امتیاز کے لیے ہمارے نزدیک چھ بنیادی اصول ہیں جن کی حیثیت فنِ حدیث میں اساسی کلیات کی ہے۔ ان اصولوں کی رہنمائی میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب روایات کے صحیح اور سقیم میں نہ صرف یہ کہ امتیاز آسان ہو جاتا ہے بلکہ علم حدیث سے کما حقہ فیض یاب ہونے کے لیے حدیث کے طالب علم کو ان کا ہمیشہ پیش نظر رکھنا از بس ضروری ہے۔

یہ ایک نہایت حساس موضوع ہے اس لئے ہم اس امر کا اہتمام ضروری خیال کرتے ہیں کہ اپنے مباحث کی بنیاد احادیثِ رسول اور سلف صالحین کے ارشادات ہی پر رکھیں، اپنی جانب سے کوئی بات نہ کہیں۔ اس موضوع پر پیچھے بھی بعض ضروری باتیں عرض کی جا چکی ہیں، یہاں مقصود ان کو ایک ضابطہ کے تحت لانا ہے تاکہ پوری بحث سمٹ کر سامنے آجائے۔

ہمارے سلف میں اصولِ حدیث پر خطیب بغدادی علیہ الرحمہ کو سند کی حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے نہایت تفصیل کے ساتھ تمام ضروری مباحث اپنی شاندار کتاب "الکفایۃ فی علم الروایۃ" میں پیش کئے ہیں۔ ہماری یہ بحث بیشتر اس کے مندرجہ ذیل ابواب سے مستنبط ہے:

۱- باب فی وجوب اطراح المنکر والمستحیل من الاحادیث (یعنی منکر اور ناممکن حدیثوں کے رد کر دینے کے وجوب کے بیان میں)۔

۲- باب ذکر ما یقبل فیہ خبر الواحد وما لا یقبل فیہ (یعنی خبر واحد کن کن صورتوں میں قبول نہیں کی جائے گی)۔

انھوں نے پورے استقصاء کے ساتھ اس موضوع پر بحث کی ہے اور رد و قبول کیلئے چھ کسوٹیاں قرار دی ہیں۔

حدیث کے غث و ثمین میں امتیاز

پہلی کسوٹی ــــ اہلِ ایمان اور اصحابِ معرفت کا ذوق

کے لئے پہلی کسوٹی یہ ہے کہ کوئی روایت جس کو اہلِ ایمان اور اصحابِ معرفت کا ذوق قبول کرنے سے ابا کرتا ہے وہ قبول نہیں کی جائے گی۔ اس اصول کی طرف نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے خود رہنمائی فرمائی ہے۔ حضور ؐ کا ارشاد ہے

عن ابی حمید ان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قال: اذا سمعتم الحدیث عنی تعرفہ قلوبکم وتلین لہ اشعارکم وابشارکم وترون انہ منکم قریب فانا اولاکم بہ۔ واذا سمعتم الحدیث عنی تنکرہ قلوبکم وتنفر منہ اشعارکم وابشارکم وترون انہ منکم بعید فانا ابعدکم منہ۔ [1]

ابو حمید سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم مجھ سے منسوب کوئی ایسی روایت سنو جس سے تمہارے دل آشنائی محسوس کریں، تمہارے رونگٹے اور تن بدن اس سے اثر پذیر ہوں اور تم دیکھو کہ وہ تمہارے دلوں سے قریب ہے تو میں تمہاری نسبت اس کے زیادہ قریب ہوں، اور جب تم مجھ سے منسوب کوئی ایسی بات سنو جس سے تمہارے دل اجنبیت محسوس کریں، تمہارے رونگٹے اور جسم اس سے ناگواری محسوس کریں، اور تم دیکھو کہ وہ تمہارے مزاج سے دور ہے تو میں تمہاری نسبت اس سے زیادہ دور ہوں۔

"جلود" کے معنی تو کھال کے آتے ہیں لیکن اس کا استعمال یہاں رونگٹوں کے لئے ہے۔ اس معنی میں اس کا استعمال قرآن مجید میں بھی ہوا ہے:

تقشعر منہ جلود الذین یخشون ربہم۔ (الزمر ۳۹:۲۳)

اس سے ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرنے والے ہیں۔

یہ عربیت کے اس قاعدے پر ہے کہ ظرف بولتے ہیں اور اس سے مظروف مراد لیتے ہیں۔ "ابشار" "بشر" کی جمع ہے۔ ہمارے نزدیک اس کا ترجمہ تن بدن کریں تو ٹھیک ترجمہ ہوگا، اس لئے کہ "بشر" اوپر کی کھال کو کہتے ہیں۔

[1] کتاب الکفایۃ فی علم الروایۃ ص ۴۳۰

اس ذیل میں سلف صالحین کے چند اقوال ملاحظہ ہوں۔ ایک بزرگ کا ارشاد ہے:

قال الربیع بن خثیم: ان من الحدیث حدیثاً لہ ضوء کضوء النہار نعرفہ، وان من الحدیث حدیثاً لہ ظلمۃ کظلمۃ اللیل ننکرہ۔ [1]

ربیع بن خثیم نے کہا کہ حدیثوں میں ایسی حدیثیں ہوتی ہیں جن پر روز روشن کی تابانی ہوتی ہے، ہم ان کو پہچان لیتے ہیں اور حدیثوں میں بعض ایسی حدیثیں بھی ہوتی ہیں جن پر شب دیجور کی سیاہی ہوتی ہے، ہمارے قلوب ان کو قبول کرنے سے ابا کرتے ہیں۔

ولید بن مسلم فرماتے ہیں:

سمعت الاوزاعی یقول: کنا نسمع الحدیث ونعرضہ علی اصحابنا کما نعرض الدرہم الزائف، فما عرفوا منہ اخذناہ وما انکروا منہ ترکناہ۔ [2]

میں نے اوزاعی کو کہتے سنا ہے کہ ہم حدیث سن کر اپنے اصحاب کے سامنے اس طرح پیش کرتے تھے جس طرح کھوٹے اور کھرے درہم، تو جن کو وہ کھرا قرار دیتے تھے ان کو تو ہم قبول کر لیتے اور جن کو وہ کھوٹا محسوس کرتے ان کو ہم چھوڑ دیتے۔

اس سلسلہ میں جریر اپنا معمول یہ بیان فرماتے ہیں:

کنت اذا سمعت الحدیث جئت بہ الی المغیرۃ فعرضتہ علیہ فما قال لی: القہ القیتہ۔

جب میں کوئی حدیث سنتا تو مغیرہ کے پاس پہنچ جاتا اور ان سے وہ حدیث بیان کرتا۔ تو جس کے متعلق وہ مجھ کو کہتے کہ اس کو پھینک دو تو میں پھینک دیتا۔

مذکورہ بالا اقوال سے چند باتیں نہایت واضح طور پر ثابت ہوتی ہیں:

ایک یہ کہ کسی حدیث کے قولِ رسول ؐ ہونے کا انحصار اس کی سند سے زیادہ اس کے معنی و مفہوم پر ہے جس کا فیصلہ وہ لوگ کر سکتے ہیں جو رسول کے کلام کا ذوق اور اس کی شناخت کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ خود کلام کو سن کر اور اپنے دل و دماغ پر اس کے اثر سے

[1] کتاب الکفایۃ فی علم الروایۃ ص ۴۳۱

[2] ایضاً ص ۴۳۱

پہچان لیتے ہیں کہ یہ رسول کا کلام ہو سکتا ہے یا نہیں؟ یہ ذوق ظاہر ہے کہ ہر شخص کے اندر نہیں پیدا ہو سکتا بلکہ انہی لوگوں کے اندر پیدا ہو سکتا ہے جن کی فطرت سلیم اور جن کا مذاق نہایت اعلیٰ ہو، جن کا ذہن سفاہت سے دور ہو، جنھوں نے رسول ﷺ کی اچھی طرح صحبت اٹھائی ہو یا آپ کے کلام کی ممارست بہم پہنچائی ہو۔

اس سے یہ بات بھی لازماً نکلتی ہے کہ اگر ایک شخص نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا صحبت یافتہ تو نہ ہو لیکن اس کو نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے کلام کی پوری ممارست ہو، اس کے پاس فہم دین کا اعلیٰ ذوق ہو اور اس نے اس کی تربیت کے لئے پوری محنت کی ہو تو کیا اس معاملے میں اس کا ذوق معتبر نہیں ہوگا؟ ہمارے نزدیک اس کو معتبر ہونا چاہئے۔ آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ درجے کا فرق ہوگا۔ اس فرق کا ہونا فطری امر ہے۔ قرآن کی اس بات کو یاد رکھئے کہ دورِ آخر میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوں گے جن کا شمار دورِ اول کے لوگوں کے زمرہ میں ہوگا تو کیا اس کا امکان نہیں ہے کہ بعد میں بھی ایسے ذوقِ سلیم کے حاملین ہوں جن کو نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے کلام کی ایسی ممارست ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ معرفت اور بصیرت کی روشنی میں امتیاز کر کے یہ کہہ سکیں کہ یہ بات تو قولِ رسول ﷺ ہو سکتی ہے، لیکن فلاں بات نہیں ہو سکتی۔

دوسری یہ کہ ہر حدیثِ رسول ﷺ دل میں ایک اہتزاز پیدا کرتی ہے، بشرطیکہ دل زندہ ہو۔ یہ اہتزاز بشارت کی نوعیت کا بھی ہو سکتا ہے اگر حدیث بشارت کی نوعیت کی ہو، خشیت کی نوعیت کا بھی ہو سکتا ہے اگر حدیث انذار کی نوعیت کی ہو۔ علیٰ ہذا القیاس وہ طمانیت، سکینت اور شرحِ صدر پیدا کرنے والی بھی ہو سکتی ہے اگر وہ حکمت کے باب کی ہے۔ بہر حال اس کو سن کر کوئی صاحبِ قلبِ سلیم یہ ممکن نہیں کہ بے حس پڑا رہ جائے بلکہ اس کے باطن میں ایک ہلچل پیدا ہوگی، اگر وہ مردہ نہیں ہو چکا ہے۔

تیسری یہ کہ جس طرح قرآن کی زبان کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے اور وہ کسی دوسرے کی زبان سے لگا نہیں کھاتی، اسی طرح سے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان کی امتیازی شان ہے۔ قرآن کی زبان اور حضور کی زبان میں بس ایک درجے کا فرق ہے اور یہ ذرا سا جو کچھ فرق ہو جاتا ہے تو فطری طور پر ایسا ہونا بھی چاہئے۔ اس لئے کہ نبی کا کلام بہر حال اللہ کے کلام کے برابر نہیں ہو سکتا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کلام میں ایک ایسی گیرائی و گہرائی اور ایسی عظمت و قیامت ہوتی ہے جو کسی دوسرے کلام میں نہیں ہوتی۔ اس کو کوئی بیان کرنا چاہے تو بیان تو نہیں کر سکتا، لیکن ایک صاحبِ ذوق محسوس ضرور کر لیتا ہے اور اس کا دل پکار اٹھتا ہے کہ یہ رسول ہی کا کلام ہو سکتا ہے۔

پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں میں معنوی جمال کے ساتھ ساتھ ایک ظاہری جمال بھی ہوتا ہے جو ان لوگوں کو نظر آتا ہے جو اس جمال سے آشنا ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس طرح کے ادا شناس ہر اس چیز میں جو حدیثِ رسول کے نام سے پیش کی جاتی ہے اس جمال کو تلاش کر لیتے ہیں۔ اگر یہ چیز ان کو نہیں ملتی تو وہ اندازہ کر لیتے ہیں کہ یہ گہر نہیں بلکہ پشیز ہے جس کو گہر کے نام سے پیش کرتے اور لوگوں کو دھوکا دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس کے برعکس اگر کسی دوسرے کا کلام رسول کے کلام کی حیثیت سے ان کے آگے پیش کیا جائے تو اس کو سنتے ہی وہ تاڑ جاتے ہیں کہ یہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا کلام نہیں ہے اگرچہ اس میں کچھ حسن بھی ہو۔ اور اگر وہ کوئی منکر بات ہو تب تو وہ بدرجۂ اولیٰ اس کو رد کر دیتے ہیں اس لئے کہ وہ رسول کے کلام میں کسی منکر بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

خود نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "انا افصح العرب والعجم" "میں عرب و عجم دونوں میں فصیح ترین ہوں۔" آپ دعاؤں کا کوئی مجموعہ لے کر پڑھئے، اگر آپ کے اندر عربیت کا کچھ ذوق ہے تو آپ فوراً امتیاز کر لیں گے کہ یہ دعا نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے ماثور ہے اور یہ بعد والوں کی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس حدیثوں میں جو اقوالِ حکمت ہیں ان کے اندر تو آپ کو یہ ماننا پڑے گا کہ شان، یہ عظمت، یہ شکوہ، یہ سادگی و پرکاری، یہ حسن و جمال اور دل ربائی جو پائی جاتی ہے تو یہ کسی عام آدمی کے کلام میں ہرگز ممکن نہیں، یہ تو پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم ہی کے کلام کی شان ہو سکتی ہے۔

بہر حال احادیث کے پرکھنے اور ان کے صحیح و سقیم میں امتیاز کے لئے ذوقِ سلیم کو بڑا دخل ہے۔ نہ تو ایک بلید آدمی اس ذوق کا حامل ہو سکتا اور نہ یہ مستعار لئے جانے کی چیز ہے۔ یہ ذوق صالح فطرت، راسخ ایمان، گہری معرفت و بصیرت اور قولِ رسول کی مسلسل ممارست سے

حاصل ہوتا ہے اور جن کے اندر یہ ذوقِ سلیم ہوتا ہے وہ جس طرح قولِ رسول کے حسن کو پرکھتے ہیں اسی طرح اس کے قدر کے صحیح کو دیکھ لیتے ہیں۔ اس لئے کہ جس کی تحویل میں جواہر ریزے ہوں وہ ان میں خزف ریزوں کو ملانا پسند نہیں کرے گا۔

یہاں اس امر کا بیان بھی ضروری ہے کہ ایسے ذوق آشناؤں کو اگر کہیں اشتباہ بھی پیش آئے گا تو بہت کم۔ اس نوع کا اشتباہ بہرحال مانعِ فہم نہیں ہوتا، بلکہ وہ سمجھنے کے لئے راہ کھولتا ہے۔ اس سے وہ اصول باطل نہیں ہوتا جو نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔

اہلِ ایمان اور اصحابِ معرفت کے ہاں اقوالِ رسول کی پہچان کی نوعیت کی وضاحت حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی اس پُرحکمت حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ:

فقالوا: كيف تعرف من لم يأت بعد من امتك؟ يا رسول الله! فقال: أرأيت لو أن رجلا له خيل غر محجلة، بين ظهري خيل دهم بهم، الا يعرف خيله؟ قالوا: بلى يا رسول الله! قال: فانهم يأتون غرا محجلين من الوضوء۔ [1]

صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ اپنی امت کے لوگوں کو کیونکر پہچانیں گے جن کو آپ نے نہیں دیکھا؟ آپ نے فرمایا: بھلا دیکھو اگر ایک شخص کے سفید پیشانی وہ سفید ہاتھ پاؤں کے گھوڑے سیاہ مشکی گھوڑوں میں مل جائیں تو وہ اپنے گھوڑے نہیں پہچانے گا؟ صحابہ نے عرض کیا بیشک، یا رسول اللہ! حضور نے ارشاد فرمایا: تو میری امت کے لوگ وضو کے آثار سے سفید منہ اور سفید ہاتھ پاؤں رکھتے ہوں گے۔

ہمارے نزدیک یہی تمثیل نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے کلام اور دوسروں کے کلام کی ہے۔ وہ بھی دور سے پہچانا جاتا ہے، بشرطیکہ ذوقِ سلیم، وہ نگاہ جو نقاد ہو۔

دوسری کسوٹی — عملِ معروف

حدیث کے غث وسمین میں امتیاز کے لئے دوسری کسوٹی عملِ معروف ہے۔ اس کی ہدایت بھی

[1] صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، باب ۱۲

صلے اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ملتی ہے:

عن محمد بن جبير بن مطعم عن ابيه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ما حدثتم عني مما تعرفونه فخذوه، وما حدثتم عني مما تنكرونه فلا تأخذوا به۔ فاني لا اقول المنكر ولست من اهله۔ [1]

محمد بن جبیر بن مطعم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر مجھ سے منسوب کرکے کوئی روایت اس معروف کے مطابق کی جائے جس سے تم آشنا ہو تو اس کو قبول کرو، اور اگر مجھ سے منسوب کرکے کوئی ایسی روایت کی جائے جس کو تم منکر محسوس کرو تو اس کو قبول نہ کرو۔ حضور نے فرمایا کہ میں منکر کہتا ہوں اور نہ میں منکر باتیں کرنے والوں میں سے ہوں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر روایت تمہاری معروفات کے مطابق ہو تو اس کو قبول کرو اور اگر ان سے متصادم ہو تو اس کو رد کردو۔ دوسرے الفاظ میں اس کو یوں سمجھئے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے دین کو غیر مطلوب حوادث سے پاک رکھنے کے لئے یہ ہدایت فرمائی کہ اگر کوئی نئی چیز تمہارے سامنے دین کے نام سے لائی جائے تو دین کا جو پاکیزہ ذخیرہ تمہارے پاس پہلے سے موجود ہے، اس سے اس کا موازنہ کرو۔ اگر یہ نئی چیز صورتاً اور معناً اس سے میل رکھنے والی ہے تو اس کو قبول کرلو، اگر یہ اس سے میل نہیں کھاتی تو اس کو رد کردو۔ ساتھ ہی آپؐ نے خود اپنا مزاج بھی بتا دیا کہ نہ میں منکر باتیں کہتا اور نہ میں ان لوگوں میں سے ہی ہوں جو منکر باتیں کہتے ہیں۔ یعنی میری نسبت یہ فرض کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ میں اچھی باتیں کہتے کہتے — العیاذ باللہ — خرافات سے بھی آلودہ ہو جاتا ہوں۔ میری زبان سے جو کچھ بھی نکلا ہے سب پاکیزہ نکلا ہے۔ اس میں کامل ہم آہنگی ہے۔ شاعروں کی طرح میں ہر وادی میں نہیں بھٹکتا۔ اس ہم آہنگی کی اگر حفاظت کروگے تو شیاطین انس وجن تمہارے جواہر ریزوں میں اپنے خزف ریزے ملانے میں کبھی کامیاب نہ ہوں گے اور اگر اس ہم آہنگی کو بھول گئے یا اس کا شعور تمہارے اندر باقی نہ رہا تو پھر سب کچھ کھو بیٹھو گے۔ اس کی وضاحت اس وجہ سے بھی ضروری تھی کہ اگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت یہ گمان کیا جا سکے کہ — العیاذ باللہ — آپ گاہ گاہ منکر باتیں بھی کر لیتے تھے تو پھر دین میں منکرات کے لئے بڑی

[1] کتاب الکفایۃ فی علم الروایۃ ص ۴۳۰

گئی ٹمش نکل آتی ہے۔ ایک شخص یہ گمان کر سکتا ہے کہ ایک خاص حالت میں۔ نعوذ باللہ۔ آپ نے یہ باتیں بھی کہہ دی ہوں گی۔

نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ جو فرمایا ہے کہ اگر مجھ سے منسوب کر کے کوئی روایت اس معروف کے مطابق کی جائے جس سے تم آشنا ہو تو اس کو قبول کر لو اور اگر مجھ سے منسوب کر کے کوئی ایسی روایت کی جائے جس کو تم منکر محسوس کرو تو اس کو نہ قبول کرو، تو اس سے حضور کی مراد کتاب اللہ اور سنتِ رسول ہے اور یہاں منکر کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ تمام چیزیں جو ان اصول، کلیات، ارشادات اور احکامات کے منافی ہوں جو حضور نے دیے ہیں۔ اس روشنی میں اگر ان اسرائیلی قصوں اور تفسیری روایات کا جائزہ لیا جائے جنھیں نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت دے کر مقدس بنا دیا گیا ہے تو معلوم ہو گا کہ وہ اس کسوٹی کی زد میں آتے ہیں، مثلاً انبیاء و رسل علیہم السلام کے عظیم الشان کردار اور شخصیت کی ایک شان تو وہ ہے جس کی نشاندہی قرآن مجید اور دیگر احادیث سے ہوتی ہے اور ایک وہ نہایت افسوسناک اور قابلِ مذمت تصویر ہے جو بعض روایات سے ملتی ہے اور جس کی زد حضرت ابراہیم، لوط، داؤد اور سلیمان علیہم السلام جیسے جلیل القدر پیغمبروں پر پڑتی ہے۔ ایسی تمام روایات منکر کے حکم میں آتی ہیں اور پھینک دیے جانے کے قابل ہیں۔ اور تو اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کی زد سے نہیں بچے ہیں۔

یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ یہی منکر روایات دینِ اسلام اور داعیِ دین پر مستشرقین کے حملوں کا ذریعہ بنی ہیں۔ آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ رنگ آمیزی کا کام انھوں نے کیا ہے لیکن مواد کے فراہم کرنے کی ذمہ داری سے آپ نہیں بچ سکتے۔

علمِ معروف کی کسوٹی اگر صحیح طریقے سے مستحضر ہو تو غلط حدیث بھی آپ کو دھوکا نہیں دے سکتی۔ آپ صاف سمجھ جائیں گے کہ یہ قرآن کے کیمپ کے بالکل خلاف ہے۔ یہ سنتِ الٰہی کے خلاف ہے، یہ حضور کے عملی تواتر کے خلاف ہے۔ بنا بریں اسے منکرات میں ڈال دینا چاہیے۔

تیسری کسوٹی ــــ قرآن مجید

حدیث کے غث و سمین میں امتیاز کے لیے تیسری کسوٹی قرآن مجید ہے۔ اس باب میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال: سیاتیکم عنی احادیث مختلفۃ، فما جاءکم موافقا لکتاب اللہ وسنتی فھو منی وما جاءکم مخالفا لکتاب اللہ تعالی وسنتی فلیس منی۔[1]	حضرت ابو ہریرہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ عنقریب تمہارے سامنے مجھ سے منسوب ایسی روایتیں آئیں گی جو باہم دگر متناقض ہوں گی تو جو کتاب اللہ اور میری سنت کے موافق ہوں وہ تو مجھ سے ہیں اور جو کتاب اللہ اور میری سنت کے خلاف ہوں وہ مجھ سے نہیں ہیں۔

اس حدیث سے ہمیں دو اصولوں کی تعلیم دی گئی ہے، لیکن ہم یہاں صرف کتاب اللہ کے کسوٹی ہونے پر بحث کریں گے، سنتِ رسول پر بحث چوتھی کسوٹی کے تحت آئے گی۔

اس میں ہمیں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ کوئی حدیث جو کسی پہلو سے قرآن کے خلاف ہو گی وہ قبول نہیں کی جائے گی۔ قرآن اور حدیث و سنت کے باہمی تعلق کے تحت اس موضوع پر ہم سیر حاصل گفتگو کر چکے ہیں۔ اس مضمون میں واضح کیا جا چکا ہے کہ قرآن ہر چیز پر نگران ہے۔ حق و باطل میں امتیاز کے لیے یہی اصلی کسوٹی ہے اس وجہ سے کوئی چیز اس کے خلاف قبول نہیں کی جا سکتی۔ بعض غالی اہلِ حدیث نے حدیث کو قرآن پر حاکم بنانے کی جو کوشش کی ہے ان کے اس غلط مسلک کی تردید حدیث کے صاحب البیت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے اس ارشاد کی روشنی میں ہو چکی ہے۔ فضل بن زیاد سے مروی ہے۔

قال: سمعت احمد بن حنبل وسئل عن الحدیث الذی روی ان السنۃ قاضیۃ علی الکتاب قال: ما اجسر علی ھذا ان اقولہ ولکن السنۃ تفسر الکتاب	وہ کہتے ہیں کہ میں نے احمد بن حنبل سے سنا اور ان سے سوال کیا گیا تھا اس قول (حدیث) کے بارے میں جس کی روایت ہوئی کہ "السنۃ قاضیۃ علی الکتاب" (سنت کتاب اللہ پر حاکم ہے) تو انھوں نے فرمایا کہ میں یہ کہنے کی جسارت نہیں

[1] کتاب الکفایۃ فی علم الروایۃ ص ۴۳۰

و تعرف الکتاب و تمیّزہ ۔ [1]

کیونکہ سنت تو قرآن کی تفسیر کرتی، اس کی تعریف کرتی اور اس کی مجمل باتوں کی وضاحت کرتی ہے۔

حدیث کے رد و تسلیم میں امتیاز کے لئے کتاب، عقل کی کسوٹی اور آگے زیر بحث آنے والی تیسری کسوٹی سنت کے بارے میں خطیب بغدادی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ

ولا یقبل خبر الواحد فی منافاۃ حکم العقل وحکم القرآن الثابت المحکم والسنۃ المعلومۃ والفعل الجاری مجری السنۃ و کل دلیل مقطوع بہ ۔ [2]

اور ان صورتوں میں خبر واحد قبول نہیں کی جائے گی جب وہ عقل کے فیصلے کے منافی ہو، جب وہ قرآن کے ثابت اور محکم حکم کے خلاف ہو، جب وہ سنت معلومہ یا اس عمل کے خلاف ہو جو سنت ہی کی طرح معمول بہ ہے اور جب وہ دلیل قطعی کے منافی ہو۔

"منافاۃ" کے معنی ہیں کھلی تضاد۔ یہاں ہم صرف مصنف علیہ الرحمہ کی قرآن کے منافی روایات کے حصے تک اپنی بحث کو محدود رکھیں گے۔ ان کے خیال میں منافی قرآن روایات قبول نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن ہر چیز کے جانچنے کے لئے ایک اور کسوٹی ہے۔ اس کی صحت میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ وہ امت کے تواتر سے ثابت ہے۔ اسی وجہ سے کوئی خبر واحد اس کے خلاف قبول نہیں کی جائے گی۔ خبر واحد نہ قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے، نہ اس میں کوئی ترمیم کر سکتی اور نہ کسی پہلو سے اس پر اثر انداز ہو سکتی۔

چوتھی کسوٹی ـــ سنت معلومہ

حدیث کے صحیح و سقیم کی پرکھ کے لئے چوتھی کسوٹی سنت معلومہ ہے۔ مجموعہ بالا احادیث کی روشنی میں سنت کا جو ذخیرہ امت کی تحویل میں ہے وہ بجائے خود بھی کسوٹی ہے۔ کوئی خبر جو اس سنت معلومہ سے بے گانہ یا متصادم ہوگی وہ قبول نہیں کی جائے گی کیونکہ سنن عملی تواتر سے ثابت ہیں۔ ان پر اخبار آحاد اثر انداز نہیں ہو سکتیں۔ سنن روایات کے بالمقابل قدیم تر ہیں۔

یہاں وہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے جو "حدیث و سنت کے درمیان فرق" سے متعلق

[1] کتاب الکفایۃ فی علم الروایۃ ص ۱۵۱ [2] ایضاً ص ۴۳۲

مضمون میں بیان کی جا چکی ہے کہ ایک ہی معاملہ میں سنت مختلف بھی ہو سکتی ہے، لیکن کسی چیز میں شکل و صورت کا کچھ اختلاف اور چیز ہے اور کسی چیز کا اس کے خلاف ہونا اور چیز ہے۔ یہ نکتہ اچھی طرح ذہن نشین رہنا چاہئے۔

سنت عملی تواتر سے ثابت ہے۔ اسی وجہ سے اس کے رد و قبول کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ اخبار آحاد کے متعلق علماء نے تصریح کی ہے کہ بعض صورتوں میں وہ لازماً رد کر دی جاتی ہیں۔ اس مسئلہ پر مفصل بحث ہم اخبار آحاد کی حجیت والے مضمون میں کر چکے ہیں جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، خطیب بغدادی کے نزدیک بھی وہ تمام اخبار آحاد جو منافی سنت معلومہ اور عمل قائم مقام سنت کے حکم میں داخل ہیں، رد کر دی جائیں گی۔

اسی طرح "الفعل الجاری مجری السنۃ" (عمل قائم مقام سنت) کے منافی خبر واحد بھی قبول نہیں کی جائے گی۔

"الفعل الجاری مجری السنۃ" سے صاحب الکفایہ کی مراد غالباً وہی چیز ہے جس کو امام مالک "العمل عندنا ھکذا" سے تعبیر کرتے ہیں یعنی کسی باب میں کوئی عمل معروف کی حیثیت سے چلا آ رہا ہے۔ اس طرح کے عمل کو امام مالک سنت ہی کے درجہ میں رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ جو عمل پوری جماعت میں اس طرح چلا آ رہا ہے اس کے متعلق قرینہ یہی ہے کہ اس کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی منظوری حاصل ہے۔ اسی وجہ سے امام مالک اہل مدینہ کی سنت کے خلاف جس طرح دوسری سنت کو قبول نہیں کرتے اسی طرح پشت ہا پشت سے لوگوں کے اس عمل کو بھی جو تواتر کے ساتھ چلا آ رہا ہے خبر واحد کے مقابلہ میں زیادہ قابل اطمینان خیال کرتے ہیں۔ یہی حال حنفیہ کا بھی ہے۔ وہ بھی ان مسائل میں جن کا تعلق عام لوگوں کی زندگی سے ہو اخبار آحاد کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے بلکہ اس عمل کو ترجیح دیتے ہیں جو لوگوں نے اپنے انتخاب و اجتہاد سے اختیار کر رکھا ہوتا ہے یا اس معاملہ میں اجتہاد کو ترجیح دیتے ہیں۔ عموم بلویٰ کی صورت میں ان کے نزدیک اجتہاد خبر واحد سے زیادہ قرین احتیاط ہے۔ اس لئے کہ ایک اجتہادی غلطی کی اصلاح تو ممکن ہے لیکن کسی روایت کو قول رسول غلط طور پر مان لینے کے بعد اس کا انکار چنداں آسان نہیں رہ جاتا۔

پانچویں کسوٹی — عقلِ کلی

عقلِ کلی حدیث کے غث و سمین میں امتیاز کے لئے پانچویں کسوٹی کا کام دیتی ہے۔ اس باب میں صاحب الکفایہ کا حوالہ اوپر گزر چکا ہے۔

عقل کے منافی روایت قبول نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ دین کی بنیاد، جیسا کہ دوسری جگہ بیان ہو چکا ہے، تمام تر عقل و فطرت ہی پر ہے۔ عقل و فطرت ہی کے مقتضیات و مطالبات ہیں جو قرآن اور سنت میں اجاگر کئے گئے ہیں اور اللہ و رسول نے عقل و فطرت ہی کے حوالہ سے لوگوں پر حجت قائم کی ہے، اور ان لوگوں کو عقل کا دشمن گردانا ہے جنھوں نے ہوائے نفس کی پیروی میں دینِ فطرت کی مخالفت کی۔ ایسی صورت میں یہ کس طرح ممکن ہے کہ کوئی ایسی روایت قبول کی جائے جو دین کی اصل بنیاد ہی کی نفی کرنے والی ہو۔ چنانچہ منافیِ عقل روایات قبول نہیں کی جائیں گی۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں زیرِ بحث فرد و افراد کی عقل نہیں بلکہ عقلِ کلی ہے جو انسانوں پر اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا شرف ہے۔ بہت سے لوگ بعض نہایت اعتقادی باتوں کو مانتے ہیں اور نہایت عقلی باتوں کی نفی کرتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ یہاں زیرِ بحث نہیں ہیں۔ یہاں صرف اس عقل سے بحث ہے جو بے لاگ ہو کر فیصلے کرتی ہے اور جس کے فیصلوں کو اس دنیا کے تمام عاقلوں کی تائید حاصل ہے۔ ایسی عقل کے فیصلے کسی ایسی چیز سے نہیں رد کئے جا سکتے جس کے متعلق یہ اعتماد نہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کی نسبت صحیح بھی ہے یا نہیں؟

یہاں یہ بھی غور کر لیجئے کہ صاحب الکفایہ نے منافات کا لفظ استعمال کیا ہے۔ منافات کے معنی جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، کلی تضاد کے ہیں۔ فرض کر لیجئے کہ دو چیزوں میں تطبیق ہو سکتی ہے تو تطبیق دے لیں۔ اس میں اعتراض کا کوئی پہلو نہیں ہے لیکن اگر صورتِ حال یہ ہے کہ نہ تو تطبیق ہو سکتی ہے اور نہ ترجیح ہی ہو سکتی تو اس شکل میں کیا کریں گے اگر اختلاف کی نوعیت راجح اور مرجوح کی ہوتی ہے تو راجح اور مرجوح کا فیصلہ کر کے راجح کو لے لیا جاتا ہے اور مرجوح کو چھوڑ دیا جاتا ہے لیکن جب ہر پہلو سے منافات ہوگی تو لازماً ایک چیز رد کر دی جائے گی۔

اسی طرح سے ایک چیز کا ایک شخص کی سمجھ میں نہ آنا الگ ہے اور منافات کا ہونا الگ چیز ہے مثلاً ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ دوزخ میں پانی بھی ہوگا، آگ بھی

ہوگی اور درخت بھی ہوں گے، تو یہ تو ہو سکتا ہے کہ بہت سے وجوہ کی بنا پر اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آ رہی ہو، لیکن یہ منافات نہ ہوگی بلکہ یہ اس کی عقل کی نارسائی ہے۔ اسی طرح سے مثلاً قرآن مجید کہتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ گنہگاروں اور نیکوکاروں، دونوں کو یکساں کر دے، تم لوگ کیسے فیصلے کرتے ہو۔ یعنی یہ ماننا کہ خدا کے ہاں اندھیر نگری ہے، کوئی نیکوکار ہو یا بدکار اللہ تعالیٰ کو اس سے کوئی بحث نہیں، اس کے ہاں دونوں یکساں ہیں، ظاہر ہے اس بات میں اور عقل میں صریح منافات ہے۔ اس بات میں تو کوئی منافات نہیں کہ دوزخ میں پانی، آگ اور درخت تینوں ہوں گے، اس لئے کہ آگ کے درخت تو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں بھی پیدا کر رکھے ہیں۔ سب سے زیادہ زوردار آگ تو پانی میں ہوتی ہے جس کو ہم دنیا میں دیکھتے ہیں۔ یہ بہر حال بات کو نہ سمجھ پانے کا چکر ہے: اس میں کوئی منافات نہیں ہے، لیکن دوسری مثال کو مان لینے سے ظلم و عدل کا سوال اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کائنات کا خالق و مالک سراپا عدل ہے۔ اس کی شہادت آفاق اور انفس میں قدم قدم پر ملتی ہے۔ اس کو غیر عادل ماننا عقل سے صریح منافات ہے۔ وہ خود تعلیم دیتا ہے کہ عدل کرو، اس کو اختیار کرو، یہی تمام انبیاء کی تعلیم ہے۔ یہی تمام آسمانی صحیفوں کی تعلیم ہے۔ اسی عدل پر آسمان و زمین قائم ہیں۔ اگر یہ عدل نہ ہوتا تو سب تباہ و برباد ہو جاتا۔ اب کس طریقے سے یہ ممکن ہے کہ اس کے لئے ظلم اور عدل، دونوں یکساں ہوں۔ عقل کے بعض دشمن یہاں تک کہتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ اگر تمام نیکوں کو جہنم میں جھونک دے تو بھی ٹھیک ہے اور اگر تمام بدوں کو جنت میں داخل کر دے تو یہ بھی ٹھیک ہے، وہ ایسا کر سکتا ہے۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ یہ بالکل عدل کے خلاف ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا اس لئے کہ یہ کائنات تو عدل ہی پر قائم ہے۔ اس کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر یہ جہان ایک لمحہ کے لئے بھی قائم نہیں رہ سکتا اور عدل میں ذرہ برابر بھی رخنہ پیدا ہو جائے تو آسمان و زمین تمام درہم برہم ہو سکتے ہیں۔ ہم بہر حال قطعی طور پر یہ مانتے ہیں کہ دین کی بنیاد عقل و فطرت پر ہے اس کی اپیل بھی اسی پر ہے اس وجہ سے دین کی کوئی بات عقل کے منافی نہیں ہو سکتی لہٰذا ایسی تمام روایات رد کر دی جائیں گی جو عقلِ کلی کے منافی ہوں گی۔

چھٹی کسوٹی — دلیلِ قطعی

حدیث کے غث و سمین میں امتیاز کے لئے چھٹی اور آخری کسوٹی دلیلِ قطعی ہے جیسا کہ ابھی گزر چکا ہے خطیب بغدادی بھی اس

اصول کو مانتے اور پیش کرتے ہیں کہ دلیلِ قطعی کے منافی خبرِ واحد قبول نہیں کی جائے گی۔

دلیل خواہ عقلی ہو یا نقلی، بہرحال ایک ایسی خبر کے مقابل میں اپنے اندر زیادہ اطمینان کا پہلو رکھتی ہے جس کی رسول کی طرف نسبت مشکوک ہے۔ اتباعِ رسول کے پہلو سے بھی مشکوک خبر کے مقابل میں دلیل کی وہ زیادہ مستحق ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ رسول سے نسبت رکھنے والی بات اگرچہ اس کی نسبت مشکوک بھی ہو عقلی فیصلوں سے زیادہ قابلِ اطمینان ہے۔ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اجتہادی غلطی میں مبتلا ہونا جھوٹ میں پڑنے سے بہرحال اہون ہے۔ اجتہادی غلطی کی اصلاح ہو سکتی ہے لیکن اگر اللہ کے رسول کی طرف کوئی غلط بات منسوب ہو کر مذہب بن گئی تو اس کے نتائج بہت دور تک پہنچیں گے اور اس کی اصلاح کا کوئی امکان باقی نہیں رہے گا۔

خلاصۂ بحث

حدیث کے فرق و کمتر میں امتیاز کے لئے چند رہنما اصول ہیں جن کی حیثیت ان بنیادی کسوٹیوں کی ہے جن پر پرکھ کر کے حدیث کے غلط و صحیح کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ اساسی کلیات یہ ہیں:

۱- کوئی روایت جس کو اہلِ ایمان اور اصحابِ معرفت کا ذوق قبول کرنے سے انکار کرتا ہے وہ قبول نہیں کی جائے گی۔

۲- جو شاذ روایت عملِ معروف کے خلاف ہوگی وہ قبول نہیں کی جائے گی۔

۳- کوئی روایت جو کسی پہلو سے قرآن مجید کے خلاف ہوگی، قبول نہیں کی جائے گی۔

۴- جو روایت سنتِ معلومہ کے خلاف ہوگی وہ قبول نہیں کی جائے گی۔

۵- جو روایت عقلِ کلی کے فیصلوں کے خلاف ہوگی وہ قبول نہیں کی جائے گی۔

۶- جو روایت دلیلِ قطعی کے خلاف ہوگی وہ قبول نہیں کی جائے گی۔ ●●

ترتیب: ماجد خاور

بشکریہ ماہنامہ "اشراق" لاہور۔

تحریکِ خلافت اور مولانا ابوالکلام آزاد

عبدالحئی فاروقی فلاحی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اسلام کے سیاسی نظام کی بنیاد تصورِ خلافت پر قائم ہے۔ خلیفہ اسلامی حکومت کا سربراہِ اعلیٰ ہوتا ہے اور اس کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ خدا کے احکام و قوانین کا نفاذ کرے۔ الذین ان مکنّٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر۔ خلافت کے ساتھ یہ تصور بھی موجود ہے کہ تمام اسلامی دنیا کا خلیفہ صرف ایک ہو سکتا ہے، بقیہ جو بھی امراء و بادشاہ ہوں گے وہ اس کے ماتحت ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ غلامان میں ہندوستان کے مسلم فرمانروا اپنی بادشاہت کی تصدیق کے لئے خلیفۂ بغداد سے ربط قائم کرتے رہے تھے۔

دورِ نبوی کے بعد خلفائے راشدین نے نظمِ خلافت کو عین منشائے شریعت کے مطابق چلایا لیکن بعد کے ادوار میں رفتہ رفتہ اس کے اندر خرابیاں پیدا ہوتی چلی گئیں لیکن اس کے باوجود سربراہِ مملکت کے ساتھ خلیفہ کا لفظ جڑا رہا اور خلافت مسلمانوں کے لئے عالمی اسلامی اتحاد کا مظہر بنی رہی۔ خلافت کے اس سلسلے کی آخری کڑی خلافتِ عثمانیہ تھی جو اپنی روح کے اعتبار سے خلافت سے کوسوں دور تھی۔ پھر بھی بعض دینی اور سیاسی اسباب کی بنا پر مسلمانوں کے لئے مرکزِ توجہ بنی ہوئی تھی۔

سترہویں صدی عیسوی کے وسط میں اہلِ یورپ نے اپنے ہوسِ اقتدار کی آگ بجھانے اور دنیا کی دولت اپنے قدموں میں سمیٹنے کی خاطر نوآبادیاتی نظام قائم کرنا شروع کر دیا لیکن ان کے ظلم و ستم اور معاشی استحصال کے خلاف مسلمانوں نے زبردست مزاحمت کی اور ان کی غلامی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ہندوستان میں علمائے حصولِ آزادی کے لئے جہاد کا راستہ اختیار کیا۔ یہ سلسلہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تعلیم و تلقین سے شروع ہوا۔ ان کے صاحبزادے عبدالعزیزؒ نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا۔ حضرت سید احمد شہیدؒ انہی کے مرید خاص تھے جنہوں نے جہاد کی تیاری کر کے سکھوں سے مقابلہ کیا۔ یہ جنگ دراصل سکھوں کے خلاف نہ تھی بلکہ بالواسطہ

حکومت برطانیہ سے تھی۔ بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں آزادی کی پہلی جنگ لڑی گئی اور انیسویں صدی کی ابتداء میں جمال الدین افغانی نے پان اسلام ازم یا اتحادِ اسلامی کا نعرہ بلند کر کے انگریزوں کے قدموں میں لرزش پیدا کر دی۔

خلافتِ عثمانیہ کی اہمیت

آزادی کی اس جدوجہد اور نعرۂ اتحادِ اسلامی کی پشت پر قوت، ایمان کے ساتھ ایک بہت بڑا سہارا خلافتِ عثمانیہ کا تھا۔ مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ خلافتِ عثمانی کے اندر کوئی خوشگوار تبدیلی ہمارے خوابوں کی تعبیر کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ چنانچہ اسی احساس کے تحت جنگ بلقان اور طرابلس کے موقع پر پوری دنیا کے مسلمانوں نے بے انتہا جوش و خروش کا مظاہرہ کیا اور اس کی فتح و شکست کو اپنی موت و حیات کا مسئلہ سمجھا۔

خلافتِ عثمانی اپنی تمام تر خرابیوں کے باوجود حسب ذیل اسباب کی بناء پر مسلمانوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔

(۱) یہ خلافت سیاسی سطح پر مسلمانوں کے لئے ایک مرکزی اسلامی اتحاد کا مظہر تھی۔ جس طرح بیت اللہ کو روحانی مرکزیت حاصل تھی اسی طرح خلافتِ عثمانی کو سیاسی مرکزیت حاصل تھی اور جس طرح ایک بے عمل مسلمان محض اپنے اسلامی عقائد کی بناء پر ایک کافر سے بہتر سمجھا جاتا ہے اسی طرح خلافتِ عثمانی اپنے نظریاتی پہلو کی افادیت کے پیشِ نظر، ایک غیر مسلم اور انگریزوں کی حکومت کے مقابلے میں قابلِ ترجیح تھی۔

(۲) خلافت کے اندر وطنی قومیت کے بجائے بین الاقوامیت کا عنصر موجود تھا۔ دنیا کے مختلف ملکوں کے مسلمان اپنی الگ الگ وطنی قومیت کے دعوے دار ہونے کے بجائے اپنے آپ کو بین الاقوامی دینی رشتۂ اخوت میں منسلک سمجھتے تھے اور خلیفہ سب کا مرجع و اولیٰ تصور کیا جاتا تھا۔

(۳) خلیفہ اپنے مقام و مرتبے کے اعتبار سے حرمین شریفین کا پاسبان سمجھا جاتا تھا چنانچہ اسلامی روایت کے مطابق خلیفہ کا مقرر کردہ آدمی ہی ارکانِ حج ادا کراتا تھا۔ حرمین سے ہر مسلمان کے فطری لگاؤ نے پاسبانِ حرم کے لئے بھی جذبۂ عقیدت و احترام پیدا کر دیا تھا۔

(۴) خلیفہ روحانی و سیاسی پیشوا سمجھا جاتا تھا اور اس طرح مسلمانوں کا ذہن اس کے متعلق بالکل صاف تھا کہ دین و سیاست دو جدا چیزیں نہیں ہیں بلکہ سیاست دین کا لازمی تقاضا ہے اور خلیفہ کا فرض ہے کہ احکامِ الٰہی کے مطابق نظمِ سیاست چلائے۔

(۵) بیشتر مسلم علاقے انگریزوں کے قبضے میں آ چکے تھے اور خلافتِ عثمانی ان کے دورِ اقتدار کی واحد یادگار تھی۔

تحریکِ خلافت کا پس منظر

انگریزوں نے پہلی جنگِ عظیم کے دوران محسوس کیا کہ خلافتِ عثمانیہ کے ساتھ مسلمانوں کی والہانہ عقیدت ہے اور اس کا وجود ہمارے لئے کسی بھی وقت خطرہ بن سکتا ہے۔ اگر اپنا اقتدار محفوظ رکھنا ہے تو خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ ضروری ہے۔ چنانچہ جنگ کے خاتمہ پر مسلمانوں کے ساتھ کئے گئے تمام وعدے بالائے طاق رکھ کر اتحادیوں نے ترکی کے حصے بخرے کر کے بانٹ لئے۔ حالانکہ جنگ کے وقت برطانیہ نے ان الفاظ میں مسلمانوں کے مقاماتِ مقدسہ کے تحفظ کی ضمانت دلائی تھی:

"ہز ایکسیلنسی وائسرائے ہند ہز مجسٹی کے گورنمنٹ کے حکم کے مطابق عرب کے مقاماتِ مقدسہ کے بارے میں، جن میں عراق کے متبرک مقامات اور بندرگاہ جدہ بھی شامل ہے مندرجہ ذیل اعلان کرتے ہیں:

ہز مجسٹی کی نہایت وفادار مسلم رعایا کو غلط فہمی نہ ہو، اس جنگ میں مذہبی جنگ کا سوال ہی نہیں ہے۔

ان مقاماتِ مقدسہ اور بندرگاہ جدہ پر برطانوی بری و بحری طاقتوں سے کبھی حملہ نہ ہوگا نہ ان کو ستایا جائے گا جب تک کہ حجاج و زائرین ہند سے، جو ان مقاماتِ مقدسہ میں جائیں، کوئی چھیڑ خانی نہ کی جائے۔ ہز مجسٹی کی گورنمنٹ کی استدعا پر گورنمنٹ فرانس اور روس نے بھی اسی طرح کا یقین دلایا ہے۔"[۳]

لیکن ان وعدوں کو جس شکل میں پورا کیا گیا اس کی بھی تفصیل جان لینا مناسب ہوگا:

• ۲۲ نومبر ۱۹۱۴ء کو بصرہ پر قبضہ کر لیا گیا۔ • ۲۳ نومبر ۱۹۱۵ء کو سلمان پاک پر حملہ ہوا۔ • مارچ ۱۹۱۷ء میں بغداد انگریزوں کے ہاتھ چلا گیا۔ • ۹ دسمبر ۱۹۱۷ء کو بیت المقدس پر انگریزی قبضہ کا اعلان جس کے لئے مسلمان نو سو سال تک صلیبی جنگوں میں مشغول رہے۔
• جون ۱۹۱۹ء میں شریف مکہ کے ذریعہ سازش کرائی گئی۔ حدودِ حرم کے اندر گولہ باری ہوئی۔
• جدہ کی بندرگاہ پر گولہ باری اور کوفہ، کربلا اور نجفِ اشرف پر حملے۔

• صلح نامہ کی دفعہ ۳۹ کے بموجب سلطان المعظم کے وہ تمام دینی و سلامی اختیارات سلب کر لیے گئے جو بحیثیت خلیفۃ المسلمین انہیں حاصل تھے اور جن کے الگ کر دینے کے بعد خلافت کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ اس دفعہ کے الفاظ یہ ہیں:

"حکومت ترکی اپنے ان تمام اختیارات سے جو حکم برادری کے یا دوسری طرح کے مسلمانوں پر رکھتی ہے، بالکل دست بردار ہوتی ہے۔ ترکی بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی طرح کے اختیارات ان ممالک پر نہ رکھے گی جو ترکی سے علیحدہ ہو گئے ہیں۔"

انگریزوں کے خلاف غم و غصہ کا لاوا تو پہلے سے ہی پک رہا تھا ترکی کے ساتھ اس ظلم و ستم اور خلافت عثمانیہ کے خاتمے نے اسے اور بھڑکا دیا۔ ۱۹۲۰ء میں یہ لاوا تحریک خلافت کی شکل میں ابل پڑا۔ مسلمانوں کے کرب و اضطراب نے ہیجانی شکل اختیار کر لی۔ اور وہی مسلمان جو کل تک "ہز مجسٹی کی نہایت وفادار مسلم رعایا" بنے ہوئے تھے، یکایک انگریزوں کے خلاف میدان میں اتر آئے۔ وفود، مراسلات، جلسے، جلوس اور ہڑتالوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے تحریک خلافت نے پورے ملک میں انگریزوں کے خلاف نفرت کا طوفان کھڑا کر دیا اور یہ تحریک کچھ دنوں کے لیے تحریک آزادی کی سب سے بڑی تحریک بن گئی۔ مسلمانوں کا مطالبہ تھا کہ ہمارے ساتھ کئے گئے وعدے پورے کئے جائیں اور برطانیہ ترکی کے متعلق اپنی پالیسیاں بدلے۔

مولانا آزاد کے نزدیک خلافت کا مقام اور خلافت عثمانیہ کی اہمیت

مولانا آزاد نے بنگال کی صوبائی خلافت کانفرنس (۲۸، ۲۹ فروری ۱۹۲۰ء) کے موقع پر خلافت کے موضوع پر جو خطبہ دیا وہ ایک عدیم المثال تحریر ہے۔ بعد میں وہ خطبہ البلاغ پریس نے "مسئلہ خلافت و جزیرۂ عرب" کے نام سے شائع کیا۔ اس کو پڑھنے سے خلافت اور خلافت عثمانی کے متعلق مولانا آزاد کا نقطہ نظر بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

اس خطبے میں مولانا نے قرآنی نصوص اور سنت کی روشنی میں خلافت کی حقیقت اور حکمت واضح کی۔ خلافت کے متعلق اٹھنے والے تمام اعتراضات کا مدلل جواب دیا خلافت خاصہ و خلافت ملوکیہ کے

عنوانات سے خلافت کے تاریخی تسلسل پر روشنی ڈالتے ہوئے مسلمانوں کے اسباب زوال کی نشاندہی فرمائی اور اس نازک مرحلے میں خلافت عثمانی کے بقا و قیام کو عین تقاضائے اسلام قرار دیا۔ مولانا نے خلاصۂ مطالب کے طور پر اپنے نتائج بحث کو ان الفاظ میں پیش کیا:

"۱: اسلام کا قانون شرعی یہ ہے کہ ہر زمانے میں مسلمانوں کا ایک خلیفہ و امام ہونا چاہیے۔ خلیفہ سے مقصود ایسا خود مختار، مسلم بادشاہ اور صاحب حکومت و مملکت ہے جو مسلمانوں اور ان کی آبادیوں کی حفاظت اور شریعت کے اجرا و نفاذ کی پوری قدرت رکھتا ہو۔

۲: اس کی اطاعت و اعانت ہر مسلمان پر فرض ہے اور مثل اطاعت خدا و رسول کے ہے تاوقتیکہ اس سے کفر بواح (صریح) ظاہر نہ ہو۔

۳: صدیوں سے اسلامی خلافت کا منصب سلاطین عثمانیہ کو حاصل رہا ہے اور اس وقت از روئے شرع تمام مسلمانان عالم کے خلیفہ و امام وہی ہیں۔ پس ان کی اطاعت و اعانت تمام مسلمانوں پر فرض ہے۔ جو ان کی اطاعت سے باہر رہا اس نے اسلام کا قلادہ اپنی گردن سے نکال دیا۔

۴: جب اسلامی حکومت یا جماعت پر غیر مسلم حملہ کریں یا حملہ کا قصد کریں یا ان کی آزادی و خود مختاری کو کسی دوسری طرح نقصان پہنچانا چاہیں تو ملک کے مسلمانوں پر یکے بعد دیگرے ان کی مدد کرنا اور حملہ آوروں سے لڑنا فرض ہو جاتا ہے۔ اگر حملہ آور طاقتور ہوں اور وہاں کی اسلامی حکومت ان کا دفاع نہ کر سکتی ہو تو جہاد کی فرضیت علی الکفایہ نہیں ہو گی بلکہ مثل نماز روزے کے فرض عین ہو گی۔

۵: اسلام کا شرعی حکم ہے کہ جزیرۂ عرب کو غیر مسلم اثرات سے محفوظ رکھا جائے۔ پس اگر کوئی غیر مسلم حکومت اس پر قابض ہو جانا چاہے یا اس کو خلیفۂ اسلام کی حکومت سے نکال کر اپنے زیر اثر لانا چاہے تو یہ صرف ایک اسلامی ملک کے نکل جانے کا ہی مسئلہ نہ ہو گا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ایک مخصوص اور سنگین حالت ہو جائے گی یعنی اسلام کی مرکزی سرزمین پر کفر کا اثر چھا جائے گا پس اس حالت میں تمام مسلمانان عالم کا فرض ہو گا کہ اس قبضہ کو وہاں سے ہٹانے کیلئے اٹھ کھڑے ہوں۔"

اس خطبے نے مسئلہ خلافت کی دینی و سیاسی اہمیت علمی انداز میں واضح کر دی اور تحریک خلافت کو ایک علمی بنیاد فراہم کر دی حالانکہ ابھی تک مسئلہ خلافت کو ایک جذباتی مسئلہ خیال کیا جاتا تھا۔ محمد رضا نرگی مغلی نے اس خطبے پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک مضمون میں لکھا ہے:

"اس کے ذریعہ مسئلہ کی دینی و سیاسی اہمیت ملک بھر کے سامنے آگئی۔ برطانوی حکومت پر بھی اس کی اہمیت عیاں ہو گئی۔ ابھی تک جو مسئلہ وقتی جذبات سے وابستہ سمجھا جاتا تھا اور خیال کیا جاتا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خود بخود ختم ہو جائے گا، اب مسلمانوں کا ایسا مسئلہ بن کر ابھر آیا کہ اس سے انحراف قومی و ملی مقاصد سے انحراف کے مترادف قرار پایا۔"

مرکزی خلافت کمیٹی کا قیام اور اس کی کوششیں

جب خلافت کا مسئلہ کھڑا ہوا اس وقت مسلمانوں کے صف اول کے بیشتر رہنما قید و بند کی مشقتیں برداشت کر رہے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ سب کے سب دسمبر ۱۹۱۹ء کے آخر یا جنوری ۱۹۲۰ء میں رہا ہوئے۔ اس وقت صرف مولانا عبدالباری فرنگی محلی باہر تھے۔ ان کے بعض معتقدوں نے مارچ کے مہینے میں بمبئی خلافت کمیٹی کی تشکیل کی۔ ۲۱ ستمبر ۱۹۱۹ء کو لکھنؤ میں مسلمانان ہند کی نمائندہ کانفرنس میں "مرکزی خلافت کمیٹی" کا قیام عمل میں آیا۔ گاندھی جی ابھی جنوبی افریقہ سے آئے تھے، انھوں نے اپنی شرائط کے مطابق تحریک خلافت کی قیادت کی ذمہ داری قبول کر لی۔ گاندھی جی اس اعلان کے ساتھ تحریک خلافت میں شریک ہوئے تھے کہ یہ مسلمانوں کا مذہبی معاملہ ہے اور جب ہمارے مسلمان بھائی بے چین ہیں تو ہم کیسے خاموش رہ سکتے ہیں۔ تحریک خلافت کے پلیٹ فارم سے گاندھی جی پہلی مرتبہ ہندوستانی سیاست میں داخل ہوئے تھے اور اگر یہ کہا جائے کہ تحریک خلافت کے ذریعہ ہی گاندھی جی ملک گیر پیمانے پر مشہور ہوئے تو بے جا نہ ہوگا۔ گاندھی جی نے لالہ لاجپت رائے، سی آر داس، لوک مانیہ تلک اور بپن چندر پال وغیرہ کو بھی رفتہ رفتہ تحریک خلافت میں شامل کر لیا۔ لالہ لاجپت رائے اور سی آر داس وغیرہ ابتداءً گاندھی جی کی ترک موالات کی تجویز سے متفق نہ تھے لیکن بالآخر ہندو و مسلم قائدین نے متحد ہو کر تحریک خلافت کو کامیاب بنانے کے لئے کوششیں شروع کر دیں۔ ملک کے طول و عرض کے دورے ہوئے۔ گاندھی جی، آزاد اور علی برادران عموماً ساتھ ہوتے، آگرہ اور بنگال کی خلافت کانفرنسوں میں مولانا آزاد نے خلافت کے موضوع پر خطبے دیئے۔ ۱۹ مارچ ۱۹۲۰ء کو ملک گیر پیمانے پر یوم خلافت منایا گیا اور پورے ملک میں زبردست ہڑتال ہوئی۔ صرف بڑے بڑے شہروں

میں ہی نہیں بلکہ مشرق گورکھپور کی ۲۵ مارچ ۱۹۲۰ء کی رپورٹ کے مطابق دیہات اور قصبات تک میں ۱۹ مارچ کو عام ہڑتال ہوئی۔

جنوری ۱۹۲۰ء میں وائسرائے کو مسلمانوں کے جذبات سے آگاہ کرنے کے لئے ایک وفد تشکیل دیا گیا۔ وفد ابھی آخری تیاریوں میں مصروف تھا کہ مولانا آزاد رہا ہو کر وہاں پہنچے۔ وہیں گاندھی جی سے ان کی پہلی ملاقات ہوئی۔ مولانا "انڈیا ونس فریڈم" میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وفد نے وائسرائے سے ملاقات کی۔ میں نے عرضداشت پر دستخط تو کر دیئے مگر وفد میں شریک نہیں ہوا۔ میری رائے تھی کہ اب معاملہ عرضداشتوں اور وفدوں کی منزل سے بہت آگے بڑھ گیا ہے۔"

مولانا آزاد ہی کا بیان ہے کہ: وائسرائے نے جواب میں کہا کہ اگر مسلمانوں کا کوئی وفد برطانوی حکومت کے سامنے مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لئے جانا چاہے تو وہ اس کے لئے ضروری سہولتیں فراہم کر سکتے ہیں۔ خود اپنے متعلق انھوں نے کہا کہ وہ کوئی بھی کارروائی کرنے سے معذور ہیں۔

وفد کی ناکامی کے بعد اگلے اقدام کے لئے جلسہ ہوا جس میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خاں اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی بھی موجود تھے۔ مولانا آزاد کے مطابق اسی نشست میں گاندھی جی نے اپنا عدم تعاون NON CO-OPERATION کا پروگرام پیش کیا۔ حکیم اجمل خاں نے کہا کہ مجھے تجویز پر غور کرنے کے لئے وقت چاہئے۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے مراقبہ کے بعد کوئی جواب دینے کو کہا اور علی برادران نے مولانا عبدالباری پر اپنے جواب کو موقوف رکھا۔ مولانا آزاد نے خود اپنے بارے میں لکھا ہے: "گاندھی جی کی اس تجویز پر مجھے یاد آیا کہ ٹالسٹائی بھی ایسی تجویز پیش کر چکا ہے اور میں نے بھی "الہلال" کے بعض مضامین میں ایسا ہی پروگرام تجویز کیا تھا۔"

یہ ساری تفصیل اس لئے بیان کرنی پڑی کہ تحریک خلافت کو کس طرح ترک موالات میں تبدیل کیا گیا اور مسلم قائدین کا اس پر عمل کیا تھا۔ اسی ضمن میں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ دسمبر ۱۹۲۰ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ناگپور میں ہوا۔ مولانا آزاد کے مطابق اس وقت تک ملک کا مزاج بدل چکا تھا اور سی۔ آر داس اور لالہ لاجپت رائے وغیرہ جو پہلے گاندھی جی کی تجویز کے مخالف

تھے، اب علانیہ اس کی تائید کرتے تھے۔ اسی سیشن سے مسٹر جناح کانگریس سے قطعی طور پر الگ ہو گئے۔ [12]

جہاد و ہجرت ۔ آزادی کے لئے ناگزیر مراحل

یہ سوال بہر حال غور طلب تھا کہ اگر حکومت برطانیہ مسلمانوں کے مطالبات تسلیم نہیں کرتی تو اگلا اقدام کیا ہونا چاہیے۔ گاندھی جی نے اس کے لئے ترک موالات کا پروگرام پیش کیا تھا۔ اس پر مسلم قائدین نے پس و پیش کیا تھا۔ اس سے قبل مسلمان شاہ اسماعیل شہیدؒ کی قیادت میں جہاد کے ذریعہ حصول آزادی کی جدوجہد کر چکے تھے لیکن غیروں کی سازشوں اور اپنوں کی بے وفائی نے اس تحریک کو مکمل کامیابی سے ہمکنار نہیں ہونے دیا۔ مولانا محمود الحسن صاحب نے بھی "مخلصین" کے نام سے ایک جماعت بنائی تھی اور غالباً راجستھان میں اسلحہ کا کوئی کارخانہ بھی بنایا گیا تھا جس کا انگریز کو کبھی پتہ نہ چل سکا۔ [13] مولانا محمود الحسن اور اہل دیوبند کی ان جہادی سرگرمیوں سے واقفیت کے لئے محمد میاں کی کتاب "تحریک ریشمی رومال" کا مطالعہ کافی ہوگا۔ مولانا حسین احمد مدنی نے اس تحریک آزادی کے متعلق جو علماء کے ہاتھوں انیسویں صدی کے ابتدائی حصہ سے شروع ہوئی "نقش حیات" میں لکھا ہے کہ ان میں فرقہ واریت اور تنگ دلی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ ان کا مقصد دنیاوی مفادات، ملک گیری، خود غرضی، عہدوں یا منصبوں کا حاصل کرنا یا کسی کو غلام بنانا نہ تھا۔ [14]

مسلم عوام شروع سے ہی محض اپنے علماء پر بھروسہ کرتے تھے۔ غیر مسلم برادران وطن پر ان کے لئے اعتماد کرنا مشکل تھا کیونکہ وہاں مسائل دین کے بجائے محض سیاسی و قومی نقطہ نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ پھر تقسیم بنگال جس کے ذریعہ مسلمانوں کو کچھ فائدہ پہنچنے کی توقع تھی [15] کے خلاف ان کے احتجاج اور پھر اس کی منسوخی نے مسلمانوں کے اعتماد کو بہت ٹھیس پہنچایا تھا۔ ۷ اگست ۱۹۰۵ء کو مہاراجہ منندر چندر نندی نے ایک احتجاجی جلسے کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

"نئے صوبے (مشرقی بنگال) میں مسلمانوں کی آبادی عظیم تر ہے اور بنگالی ہندوؤں کی تعداد محدود تر۔ اس طرح ہم اپنی سرزمین پر اجنبی بن کر رہ جائیں گے اور خدشہ ہے کہ بالکل ختم ہو جائیں گے۔" [16]

ظاہر ہے اس صورت حال میں مسلمانوں کے لئے غیر مسلم قیادت پر اعتماد کرنا بہت مشکل تھا۔

البتہ تحریک خلافت نے ایک مرتبہ پھر انھیں مسلم زعماء کے زیر قیادت لا جمع کیا تھا اور یہی موقع تھا جب وہ اپنی سابقہ روایات کے مطابق اسلامی نقطہ نظر سے مسئلے کا حل نکالیں۔ مولانا آزاد بھی مسلمانوں کی نفسیات سے واقف تھے اور ان کے دین کا تقاضا بھی یہی تھا۔ چنانچہ انھوں نے جہاد و ہجرت کی شکل میں اس کا حل تجویز کیا۔ بنگال خلافت کانفرنس کے دوسرے دن مولانا نے ایک اسکیم کی بنیاد ڈالی جس کے متعلق مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی لکھتے ہیں:

"مولانا کی اسکیم کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمان کو مذہب کی راہ سے منظم کیا جائے، مسلمانوں کا ایک امام ہو اور امام کی اطاعت کو وہ اپنا دینی فریضہ سمجھیں، مسلمانوں میں یہ دعوت مقبول ہو سکتی ہے اگر قرآن و حدیث سے انھیں بتا دیا جائے کہ امام کے بغیر ان کی زندگی غیر اسلامی ہے۔ اور ان کی موت جاہلیت پر ہوگی۔ جب مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد امام کو مان لے تو امام ہندوؤں سے معاہدہ کر کے انگریزوں پر جہاد کا اعلان کرے اور ہندوؤں و مسلمانوں کی متحدہ قوت سے انگریزوں کو شکست دے دی جائے گی۔" [17]

گویا ابتداءً مولانا آزاد مسئلہ خلافت کو خالص دینی تقاضے کے تحت جہاد کے ذریعہ حل کرنا چاہتے تھے۔ ذکر آزاد میں عبدالرزاق ملیح آبادی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے امامت کی خاطر اپنی بیعت بھی لینی شروع کر دی تھی اور عبدالرزاق ملیح آبادی کو یوپی میں بیعت لینے کے لئے خلیفہ مقرر کیا تھا اور ایک تحریر دی تھی۔ [18] مولانا ملیح آبادی کے نام مولانا ابوالکلام آزاد کے ۲۸ ستمبر ۱۹۲۰ء کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب، سندھ اور بنگال کی حد تک بیعت کا کام پورا ہو چکا تھا۔ [19] مولانا محمود الحسن صاحب نے بھی مولانا آزاد کی امامت کی تائید کی تھی۔ [20]

لیکن ستمبر ۱۹۲۰ء میں مولانا نے تحریک امامت کو ختم کر دیا جس کا سبب انھوں نے خود کبھی نہیں بتایا البتہ مولانا ملیح آبادی کا خیال ہے کہ مولانا محمد علی بھی ان دنوں ہندوستانی سیاست میں بڑی تیزی سے ابھر رہے تھے اور وہ مولانا آزاد کے سخت مخالف تھے۔ مولانا نے محسوس کیا کہ علی برادران کے ساتھ تصادم مسلمانوں میں پھوٹ ڈالے گا جو کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ [21]

مولانا آزاد نے جہاد کے ایک ناگزیر مرحلے ہجرت کی طرف بھی مسلمانوں کو متوجہ کیا تھا اور ہجرت کے متعلق ایک فتویٰ شائع کیا تھا جس کا متن حسب ذیل ہے:

"تمام دلائل شرعیہ، حالات حاضرہ، مصالح جمہور امت اور مقتضیات و مصالح پر نظر ڈالنے کے بعد پوری بصیرت کے ساتھ اس اعتقاد پر مطمئن ہو گیا ہوں کہ مسلمانان ہند کے لئے بجز ہجرت کوئی چارۂ شرعی نہیں ہے۔ ان تمام مسلمانوں کے لئے جو اس وقت ہندوستان میں سب سے بڑا عمل انجام دینا چاہیں ضروری ہے کہ وہ ہندوستان سے ہجرت کر جائیں البتہ جن لوگوں کی نسبت ظن غالب ہو کہ مقصد کی جدوجہد اور کلمۂ حق کے اعلان و تذکیر کے لئے ان کا قیام ہندوستان میں بمقابلہ ہجرت زیادہ ضروری ہے یا جو لوگ عذرات مقبولہ شرع کی بنا پر ہجرت نہ کر سکیں یا اتنی بڑی آبادی کی نقل و حرکت میں قدرتی طور پر جو تاخیر ہونی چاہئے اس کی وجہ سے جو تاخیر ہو سو بلاشبہ وہ لوگ ٹھہر سکتے ہیں۔ ان لوگوں کو اپنی قوتیں اتباع شریعت کے لئے وقف کر دینی چاہئیں۔" عـــه ۲۲

ہجرت ہی کے متعلق مولانا عبد الباری نے ایک استفتاء کے جواب میں لکھا:

"ہجرت کے متعلق میں اعلان کرتا ہوں کہ وہ تمام مسلمان جو اپنے ضمیر قلب یا ایمان کو مطمئن نہیں کر سکتے وہ اب اسلام کے احکام کے مطابق عمل پیرا ہوں اور اس ملک سے ہجرت کر کے ایسے مقام پر چلے جائیں جہاں اسلام کی خدمت انجام دینا اور اسلامی قوانین (شریعت) کے مطابق عمل کرنا بہتر طریق ممکن ہو۔" ۲۳

"ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے ۲۸ مارچ ۱۹۲۰ء کو لاہور میں تقریر کی جس میں اگرچہ انھوں نے تحریک عدم تعاون کی تائید کی لیکن جس انداز سے انھوں نے تقریر کی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عوام کی طرف سے جہاد اور ہجرت کا مطالبہ ہو رہا تھا لیکن کچلو نے اس کی فرضیت اور اہمیت تسلیم کرنے کے باوجود کہا کہ یہ عملاً ممکن نہیں ہے اور ایسی صورت میں سوائے ترک موالات کے

عـــه یہ فتویٰ اہلحدیث امرتسر کی ۲۰ جولائی کی اشاعت میں درج ہوا ہے۔ فتویٰ کی تاریخ کے متعلق مولانا غلام رسول مہر نے صرف اتنا لکھا ہے کہ مولانا نے ۱۹۲۰ء میں فتویٰ دیا تھا۔ بہر حال چونکہ مولانا جنوری میں رہا ہوئے تھے اور جولائی ۱۹۲۰ء میں یہ فتویٰ شائع ہوا اس لئے وہ جنوری اور جولائی ۱۹۲۰ء کے مابین کا ہے۔

اور کوئی چارہ نہیں ہے۔" ۲۴

ان علماء کے فتویٰ ہجرت پر ایک بڑی تعداد نے افغانستان کی طرف ہجرت کی لیکن قیام کا مناسب بندوبست نہ ہونے کے سبب واپس آنا پڑا۔ ۲۵

ان ساری تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلم قائدین گاندھی کی پیش کردہ تجویز کے متبادل کی تلاش میں تھے اور جہاد و ہجرت کے ذریعہ خلافت کو حل کرنے کی تدبیریں سوچ رہے تھے۔ گرچہ ان تمام لوگوں نے بعد میں ترک موالات میں بھرپور حصہ لیا لیکن جہاد و ہجرت کا راستہ چھوڑ کر ترک موالات جیسے ابتدائی طریقہ کار پر عمل کرنا بعض مجبوریوں کی بنا پر تھا جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

اولاً تو اس میں کامیابی مشکوک نظر آتی تھی۔ اس سے پہلے اس طرح کی بعض کوششیں ہو چکی تھیں جس میں کوئی بڑی کامیابی نہیں مل سکی۔ جہاد کے نام پر برادران وطن سے کسی تعاون کی امید معدوم تھی اور بغیر ایک منضبط گروہ کے برٹش حکومت کی بھی جابرانہ قوت سے ٹکر لینا مشکل تھا۔

ثانیاً خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد کسی اور طرف سے مدد ملنے کی توقع بھی نہیں تھی۔ تمام مسلم ممالک خود مصیبت میں مبتلا تھے۔

ثالثاً مسلمانوں کے اندر سیاسی بیداری پیدا ہونے کے باوجود ایک اچھی تعداد اب بھی انگریزوں کی وفادار تھی اور وہ لوگ جو کل ہی ان کی وفاداری سے نکلے ہوں انھیں دوسرے ہی دن اپنے آقا کے مقابلے میں لا کھڑا کرنا مشکل تھا۔

رابعاً ہجرت کا معاملہ بھی آسان نہ تھا۔ سات کروڑ کی آبادی منتقل ہو کر یک وقت کہاں جا سکتی تھی۔ جو لوگ ہجرت کر کے گئے انھیں بھی واپس آنا پڑا۔

پھر بھی یہ کہنا مطلقاً صحیح نہیں کہ اس نسخے کو بالکل نہیں آزمایا گیا۔ اس کا ابتدائی کام مولانا آزاد کی بیعت کی شکل میں شروع ہو چکا تھا لیکن کچھ دنوں بعد اسے روک دینا پڑا جس کا سبب مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی کے بقول علی برادران کی مخالفت کی وجہ سے مسلمانوں کے اتحاد کے ٹوٹنے کا اندیشہ تھا۔

تحریک خلافت میں مولانا آزاد کی شمولیت کی نوعیت

مولانا آزاد کے ساتھ یہ صریح ناانصافی ہے کہ انہیں عموماً محض ایک وطن پرست لیڈر کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ قومی نقطۂ نظر کے حاملین تحریک آزادی میں مولانا کی جد و جہد اور تحریک خلافت کی سرگرمیوں سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ مولانا ایک قوم پرست لیڈر تھے، وطن پرستی ہی ان کا مطمح نظر تھا، تحریک خلافت اور ترک موالات کے دوران مولانا نے جو خطبے دیئے اور قرآن و احادیث سے ثابت کیا کہ یہ مسلمانوں کا خالص دینی مسئلہ ہے۔ اس کی تاویل ان لوگوں نے یہ کی ہے کہ مولانا مذہب کی راہ سے مسلمانوں کو سیاست میں لانے کی کوششیں کر رہے تھے۔[۲۶] حالانکہ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۵ء تک مولانا کی تحریریں پڑھنے سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا سیاسی میدان میں اور آزادی کی جد و جہد کو عین تقاضائے اسلام قرار دے رہے تھے۔ یہ مسلمانوں کو مذہب کی راہ سے سیاست میں لانے کی کوشش نہیں بلکہ مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے اور دنیا میں اپنا مقام و مرتبہ پہچاننے کی دعوت تھی۔ الاسلام یعلو ولا یعلیٰ علیہ۔ چنانچہ تحریک خلافت کے دوران مولانا کے خطبے، اتحاد اسلامی کی صدائے بازگشت، دوران تحریک خلافت حزب اللہ کی تشکیل، اس کے لئے سورۂ بقرہ کی آیت ۱۲۰ کو اس کی بنیاد بنانا، حزب اللہ کی رکنیت کے لئے شرائط اور جہاد و ہجرت کی تلقین آخر کیا ثابت کرتے ہیں۔ مولانا آزاد حزب اللہ کا خاکہ تو ۱۹۱۳ء، ۱۹۱۴ء کے درمیان ہی پیش کر چکے تھے اور الہلال بند ہونے کے بعد اس سلسلے میں بظاہر خاموشی اختیار کر لی تھی لیکن PRESIDENCY COLLAGE کلکتہ میں تاریخ کے استاد پروفیسر جیت بسے کے ایک مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی یہ تحریک خفیہ طور پر ۱۹۲۵ء تک چلتی رہی اور خفیہ پولیس کی رپورٹوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ حزب اللہ حکومت کی نظر میں ایک انقلابی جماعت تھی۔ ہندو بنگالی زمین دوز انقلابی جماعتیں بھی اسے اسی نقطۂ نظر سے دیکھتی تھیں۔[۲۷]

مولانا کی ان سرگرمیوں کو اگر تحریک خلافت کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ مولانا تحریک خلافت کے ذریعہ مسلمانوں کے اندر آنے والی سیاسی بیداری کو بھی اپنے اسی انقلابی مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے اور تحریک خلافت میں آپ کی شمولیت اسی

نقطۂ نظر سے کہ مسلمان متحد ہو کر ایک جھنڈے تلے آجائیں اور اپنا مستقبل خود سنوارنے کی کوشش کریں۔

ترک موالات کے متعلق مولانا آزاد کا نقطۂ نظر

قاضی محمد عباسی صاحب نے "تحریک خلافت" میں ایک اچھا سوال اٹھایا ہے کہ جب مولانا آزاد نے ہجرت کا فتویٰ جاری کر دیا تو پھر ترک موالات کا کیا مطلب۔ جبکہ دونوں میں قطبین کا فاصلہ ہے۔ ہجرت کا مطلب ہے اس ملک کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے یہاں سے چلے جانا اور ترک موالات تو وہ کرے گا جس کا عزم راسخ یہاں رہنے کا ہو۔ مولانا کو خاص قومی ہیرو کی شکل میں پیش کرنے والے لوگ اس سوال کو نظر انداز کر جاتے ہیں اور گاندھی کے ساتھ ترک موالات میں مولانا کی سرگرمیوں سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ مولانا نے گاندھی جی کی تجویز اور نقطۂ نظر کی حمایت کی لیکن اگر مذکورہ بالا سوال کو کوئی اہمیت دی جائے تو اصل بات یوں بنتی ہے کہ مولانا کے نزدیک اصولی طور پر مسئلے کا حل تو ہجرت و جہاد ہی تھا۔ البتہ چونکہ انگریز غاصب اور فریق محارب تھا اور فریق محارب کے ساتھ دوستانہ روابط رکھتے ہوئے جہاد ممکن نہ تھا، اس لئے اس سے قطع علائق اور ترک تعلق ضروری تھا۔ چنانچہ ترک موالات کی اس حکمت کی طرف مولانا نے اسی فتوے میں اشارہ کیا تھا:

"گزشتہ نومبر کے جلسۂ دہلی سے لے کر ۱۰ اپریل کے جلسۂ خلافت بمبئی تک نان کوآپریشن کو منظور و مقبول کرانے کی جس قدر کوششیں کی گئیں کہ وہ منظور ہو گیا اس کی بنا یہی تھی۔"[۲۸]

فتوے میں اس عبارت سے قبل اس بات کا تذکرہ ہے کہ شرعی معذوریوں یا علائق کلی الحق کے لئے جو لوگ ٹھہرنا چاہیں وہ اس فتویٰ ہجرت کے حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ اس طرح جو لوگ کسی مجبوری کی وجہ سے ٹھہر جائیں ان کے لئے ترک موالات ضروری ہے گویا اصل حکم تو ہجرت کا ہے البتہ جو ہجرت نہ کر سکیں ترک موالات ان کے لئے ہے۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ گرچہ گاندھی جی نے تحریک خلافت کو ترک موالات کی تحریک میں تبدیل کیا پھر بھی مولانا آزاد اسی ترک موالات کے ذریعہ اپنا تحریک خلافت کا مقصد حاصل کرنے کی جد و جہد میں مصروف رہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ بعض لوگوں کی کوششوں سے

تحریک خلافت نے ترک موالات کی تحریک کی شکل اختیار کر لی اور اس کا یہی پہلو زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔

ترک موالات کے دور رس منفی اثرات

تحریک خلافت اور ترک موالات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ تحریک خلافت تو شروع ہوتی تھی خلافت عثمانیہ کے مسئلہ پر اور ترک موالات کی تجویز انگریزوں پر ایک دباؤ ڈالنے کے لئے پیش کی گئی تھی لیکن بعد کے ادوار میں ہم دیکھتے ہیں کہ تحریک خلافت کے مطالبات اور اس کی روح پس پشت پڑ جاتے ہیں اور ترک موالات انگریز دشمنی کی ایک تحریک بن جاتی ہے۔ اس بات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ اس تبدیلی کے کیا اثرات مرتب ہوتے۔ میرے ناقص مطالعہ کی حد تک یہ اثرات حسب ذیل تھے:

۱۔ تحریک خلافت نے پہلی مرتبہ مسلمانوں کے اندر سیاسی بیداری پیدا کی تھی اور انھیں انگریزوں کے خلاف ہندوؤں کے ساتھ متحد کر دیا تھا لیکن تحریک خلافت کے اندر بین الاقوامیت کا ایک پہلو غالب تھا یعنی ساری دنیا کے مسلمان ایک ہیں۔ سب ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہیں اور خلافت عثمانیہ کا مسئلہ ہمارا اپنا مسئلہ ہے لیکن ترک موالات نے اس کے بین الاقوامیت کا پہلو ختم کر کے اسے ایک خالص قومی چیز بنا دیا یعنی ہندو مسلمان دونوں انگریزوں کے ظلم کا شکار ہیں اور انھیں مشترکہ مفاد کے لئے مشترکہ جد و جہد کرنی چاہئے۔ تحریک خلافت کی بنیاد مثبت تھی جبکہ ترک موالات کی منفی۔

۲۔ تحریک خلافت کو مسلمانوں نے ایک دینی فریضہ سمجھ کر شروع کیا تھا۔ یہ تحریک سیاسی تربیت کے ساتھ ساتھ ان کی روحانی تربیت کا سامان بھی فراہم کر رہی تھی۔ ترک موالات نے اس کی دینی حیثیت ختم کر کے اسے محض ایک سیاسی حربہ بنا دیا۔

۳۔ تحریک خلافت میں انگریزوں کی مخالفت کے ساتھ ساتھ یہ مثبت پہلو موجود تھا کہ مسلمانوں کا سیاسی نظام خلافت کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے اور اگر اس جد و جہد کے نتیجے میں مسلمان کامیاب ہوتے ہیں تو ان کا اگلا قدم قیام خلافت کا ہونا چاہئے۔ ترک موالات نے یہ مثبت پہلو ختم کر کے اسے محض انگریز دشمنی تک محدود کر دیا۔

۴۔ تحریک خلافت جد و جہد آزادی کو فکری طور پر شاہ اسمٰعیل شہید، مولانا محمود الحسن اور جلال الدین افغانی اور عالم اسلام میں آزادی کی خاطر جد و جہد کرنے والی دیگر تحریکات سے منسلک کر رہی تھی کیونکہ ان کا فکری ماخذ ایک تھا۔ ترک موالات نے اس فکری سوتے کو بند کر کے اس کی جڑیں ہندوستانی قومیت میں گاڑ دیں اور اگر یہ کہا جائے کہ تحریک ترک موالات متحدہ قومیت کے لئے ہراول بھی تو بے جا نہ ہوگا۔

اسی طرح غالباً یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ مولانا آزاد نے تو نہیں البتہ گاندھی جی نے ترک موالات کی تجویز پیش کر کے مسلمانوں کو متحدہ قومیت میں ضم کرنے کی کوشش کی۔ ..

حوالہ جات

۱ قرآن کریم، سورۂ حج، آیت ۴۱

۲ MOHD HABIB & KHALIQ AHMAD NIZAM: A COMPRIHENSIVE HISTORY OF INDIA VOL VI, PEOPLI,S PUBLISHING HOUSE N-DELHI MAY 1982. P. 213.

تغلغانی صاحب نے خلیفہ بغداد کی طرف سے ایک پروانہ تقرری آنے کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ پروانہ ۲۲ ربیع الثانی ۶۲۶ھ / ۱۸ فروری ۱۲۲۹ء کو التمش کے پاس پہنچا۔

بلبن اپنا سیاسی اختیار تسلیم کرنے کے لئے خلیفہ بغداد سے تصدیق کا بار بار حوالہ دیتا ہے۔ اس کے نزدیک بھی خلیفہ کی حیثیت مسلمانوں کے سب سے بڑے سربراہ کی تھی۔ وہ خطبوں میں خلیفہ کا نام پڑھتا تھا اور اس کے سکوں پر بھی خلیفہ بغداد کا نام درج تھا۔ حوالہ مذکورہ ص ۲۸۴

۳ آزاد، ابوالکلام، مسئلہ خلافت، مکتبہ احباب، دسن پورہ، لاہور ص ۳۳۲۔

۴ ایضاً ص ۳۳۶ — ۳۳۷

۵ ایضاً ص ۲۸۳ — ۲۸۵

۶ محمد رضا فرنگی محلی۔ تحریک خلافت میں مولانا ابوالکلام کا حصہ، ماہنامہ آج کل مولانا آزاد نمبر نومبر ۱۹۵۸ء ص ۴۱۔

۷؎ ایضاً ص ۴۳

۸؎ قاضی محمد عدیل عباسی، تحریک خلافت، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی ۱۹۸۲ء ص ۱۴۳

۹؎ مولانا آزاد کی انگریزی سوانح "انڈیا ونس فریڈم" کا اردو ترجمہ "ہماری آزادی" مترجم محمد مجیب
اورینٹ لانگ مین۔ ۱۹۶۱ء ص ۴۴

۱۰؎ ایضاً ص ۲۴۔ ۱۱؎ ایضاً ص ۲۵۔ ۱۲؎ ایضاً ص ۲۷۔

۱۳؎ قاضی محمد عدیل عباسی۔ محولہ بالا۔ ص ۴۷۔ ۱۴؎ ایضاً ص ۴۱۔

۱۵؎ سلیم منصور خالد۔ البدر۔ ادارہ مطبوعات طلبہ۔ لاہور جنوری ۱۹۸۸ء ص ۱۱

۱۶؎ ایضاً ص ۱۲

۱۷؎ عبدالرزاق ملیح آبادی۔ ذکر آزاد۔ دفتر آزاد ہند کلکتہ ۱۹۶۰ء ص ۲۲

۱۸؎ ایضاً ص ۲۵

۱۹؎ قاضی محمد عدیل عباسی۔ محولہ بالا۔ ص ۱۳

استفتاء

مختلف مساجد میں تنظیم اسلامی پاکستان کی جانب سے تراویح کی نماز میں ترجمۂ قرآن کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ یہ ایک مستحسن کام ہے۔ ناظم آباد، کراچی کی ایک مسجد میں اس سال رمضان میں یہ سلسلہ چل رہا تھا کہ بعض لوگوں کی طرف سے اس کے خلافِ شرع ہونے کا فتویٰ صادر ہوا۔ مسئلہ نازک اور اہم تھا۔ مختلف دینی درسگاہوں کے نام ایک استفتاء مرتب کر کے بھیجا گیا۔ ان درسگاہوں کے مفتی حضرات نے جواز کا فتویٰ دیا۔ ہم معاصر "میثاق" لاہور کے شکریہ کے ساتھ استفتاء اور اس کے جوابات نذرِ قارئین کرتے ہیں۔ (مرتب)

استفتاء: مورخہ ۷ رمضان المبارک سنہ ۱۴۰۹ھ

السلام علیکم

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل کچھ لوگوں نے قرآن کریم کی تعلیمات مسلمانوں میں عام کرنے کی غرض سے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ رمضان المبارک میں قیام اللیل کی نیت سے تراویح اس طرح ادا کی جاتی ہے کہ ہر چار رکعت کے بعد تراویح میں پڑھے جانے والے قرآن کریم کی تو ترجمہ اور مختصر تشریح بیان کی جاتی ہے اور پھر حافظ صاحب چار رکعت تراویح سناتے ہیں اس طرح ترجمہ اور تشریح میں ۴۵ منٹ صرف ہوتے ہیں اور نماز میں ۱۵ منٹ۔ بارہ رکعت کے بعد ۱۵ منٹ چائے کا وقفہ ہوتا ہے۔ اس طرح تقریباً ۵ گھنٹے صرف ہو جاتے ہیں۔ اب اس بارے میں یہ دریافت کرنا ہے کہ:

۱۔ کیا یہ طریقہ عبادت "بدعت حسنہ" کی تعریف میں آتا ہے؟

۲۔ کیا ہمارے اسلاف میں اس طریقہ کی کوئی مثال ملتی ہے؟

۳۔ کیا اس سے تراویح کی روح ختم ہو جاتی ہے؟

۴- کیا اس طرح مسنون تراویح ادا ہو جاتی ہے؟

۵- کیا اس طرح قیام اللیل کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے؟

ازراہ کرم ان سوالات کے جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

شکریہ: والسلام علیکم

دارالعلوم کراچی کے دارالافتاء کی جانب سے مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ کی توثیق و تصویب کے ساتھ اس استفتاء کا حسب ذیل جواب موصول ہوا۔

الجواب

"طریقہ بالا کے مطابق تراویح ادا کرنا چند شرائط کے ساتھ جائز ہے، ایک یہ کہ اس طرح تراویح ادا کرنے کو شرعی لحاظ سے واجب یا سنت نہ سمجھا جائے، دوسرے یہ کہ جہاں تراویح بغیر ترجمہ اور تشریح کے ہوتی ہوں ان تراویح کو غلط یا ناقص نہ سمجھا جاتا ہو اور ان پر طعن و تشنیع نہ کی جاتی ہو۔ تیسرے ذکر کردہ طریقے سے تراویح ادا کرنا شریک ہونے والوں پر اکتاہٹ اور بوجھ کا باعث نہ ہو۔ چوتھے یہ سب کچھ ایسے انداز سے ہوتا ہو کہ جو لوگ اس میں شریک نہ ہوں ان کے ذکر و تلاوت یا آرام و راحت میں خلل نہ آتا ہو مثلاً تلاوت، ترجمہ و تشریح کے لئے لاؤڈ اسپیکر اگر استعمال ہوتا ہو تو اس کی آواز مسجد کے اندر اندر رہتی ہو مسجد کے باہر نہ جاتی ہو ــــ اگر ان شرائط میں سے کوئی شرط مفقود ہو تو پھر تراویح کا یہ طریقہ درست نہیں، واجب الترک ہے۔" واللہ اعلم۔

الجواب صحیح — بندہ عبدالرؤف سکھروی، دارالافتاء

احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ (۱۲-۹-۱۴۰۹ھ) — دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴ (۱۲-۹-۱۴۰۹ھ)

نائب مفتی دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴

جامعہ نعیمیہ لاہور کے مفتی محمد حسین نعیمی صاحب مدظلہ کی جانب سے اس استفتاء کا حسب ذیل جواب موصول ہوا۔

الجواب ھو الموفق للصواب

شریعت مطہرہ کی رو سے رمضان المبارک میں قرآن کریم کو تراویح میں سننا اور سنانا سنت ہے۔ یہ اس لئے کہ شریعت کا منشاء یہ ہے کہ کم از کم سال میں ایک بار تمام مسلمان قرآن کریم یعنی اللہ تعالیٰ کے فرامین و احکام کو تازہ کر سکیں اور ہر مسلمان قرآن کریم میں ارشادات الٰہی سے واقف ہو۔

خوش نصیب ہیں وہ افراد جو عربی زبان سے واقف ہیں اور قرآن کریم کے احکام سے بلاواسطہ واقفیت کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ عربی سے ناواقف افراد کے لئے اگر کسی دوسری زبان میں تشریح کی جائے تو اس میں شرعاً کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

نیز تراویح کی تمام رکعات میں اتصال ضروری نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر چار رکعت کے بعد وقفہ کیا جاتا ہے جس کو فقہ میں "ترویحہ" کہتے ہیں۔ "تراویح" اس کی جمع ہے۔ تراویح کے پڑھنے میں عجلت اور تسلسل مطلوب و مرغوب نہیں ہے۔ ابتدائے دور صحابہ میں کعبہ مکرمہ میں ہر چار رکعت کے بعد نمازی کعبہ کا طواف کرتے تھے لہٰذا نیک مقصد اور تبلیغ کے لئے ہر چار رکعت کے بعد ان میں پڑھے ہوئے قرآن کریم کی تشریح کی جائے تو یہ ہر طرح شرعاً مطلوب و محبوب ہے لیکن ہر شخص پر اس میں شرکت ضروری قرار نہ دی جائے، باذوق اور اسلام سے لگاؤ رکھنے والے شریک ہوں تو بہتر ہے، اور شرعاً جائز ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مفتی محمد حسین نعیمی

دارالافتاء، جامعہ نعیمیہ، لاہور"

جامعہ اشرفیہ لاہور کے دارالافتاء سے اس استفتاء کے سوالات کے ترتیب وار مختصر جوابات موصول ہوئے۔

پہلے سوال کے جواب میں فرمایا گیا کہ اس طریقہ عبادت کو لازمی قرار دینا بدعت ہے۔ اسلاف میں اس طرح کی کسی مثال کے بارے میں سوال کے جواب میں لاعلمی کا اظہار کیا گیا۔ اس سوال کا جواب کہ "کیا اس طرح ترویحہ کی روح ختم ہو جاتی ہے؟" نفی میں دیا گیا۔ چوتھے سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ اس طرح مسنون تراویح ادا ہو جائے گی۔ آخری سوال قیام اللیل کے مقصد کے بارے میں تھا۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ مقصد حاصل ہو جائے گا بشرطیکہ کوئی غیر شرعی کام نہ کیا جائے۔

آخر میں جناب مفتی صاحب مدظلہ نے اپنا نوٹ بایں الفاظ تحریر کیا:

"اگر لوگوں پر بار ہوتا ہو تو صرف تراویح میں قرآن پڑھنے پر ہی اکتفا کیا جائے اور ترجمہ و تفسیر کسی دوسرے وقت میں بیان کیا جائے، اور اگر دقت کو لوگوں پر بار نہ ہو تو تراویح کے درمیان یا بعد میں بیان کرنا درست ہے۔"

فقط واللہ اعلم بالصواب

دارالافتاء جامعہ اشرفیہ، لاہور ــــ ۱۲ رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ

مذکورہ بالا استفسار اور ان کے جوابات سے درج ذیل امور بالکل واضح ہو کر سامنے آتے ہیں:

(۱) اس طریقۂ عبادت کو بدعت قرار دینا درست نہیں۔ ہاں اگر اسے لازمی سمجھ لیا جائے اور یہ باور کیا جانے لگے کہ تراویح صرف اسی طور سے پڑھنا جائز اور درست ہے تب یہ بدعت اور خلافِ شرع قرار پائے گا لیکن ظاہر بات ہے کہ ہم نے تراویح کے ساتھ ترجمۂ قرآن کو نہ کبھی لازم سمجھا اور نہ کبھی اسے فرض و واجب قرار دیا۔ ہمارے نزدیک کوئی نہایت احمق یا بدنیت شخص ہی یہ جسارت کر سکتا ہے۔ لیکن ہمیں تعجب ہوتا ہے ان لوگوں کے حال پر جو نمازِ تراویح کے ساتھ ترجمۂ قرآن کو بدعت اور غیر مشروع قرار دینے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں، حالانکہ یہ اُسی نوع کا معاملہ اور اضافہ ہے جس قسم کا اضافہ ہمارے ہاں جمعے کے نظام میں رائج اور مقبول ہے۔ دیکھیے نمازِ جمعہ کی خصوصی اہمیت خطبۂ جمعہ کی وجہ سے ہے اور خطبۂ جمعہ کا اصل مقصود ہے تذکیر و موعظت! لیکن خطبہ چونکہ اصلاً عربی زبان میں ہوتا ہے اور عربی زبان سے ہماری عظیم اکثریت ناواقف و نابلد ہے لہٰذا اصل مقصود یعنی تذکیر کو کسی نہ کسی درجے میں واصل کرنے کے لئے علماء کرام نے خطبے سے قبل اردو زبان میں بیان و تقریر کا سلسلہ شروع کیا جسے نہ صرف یہ کہ تمام مسالک کے فقہاء سندِ جواز عطا کرتے ہیں بلکہ اس پر سب عمل پیرا بھی ہیں۔ تراویح میں قرآن سننے اور سنانے سے اصل مقصود بھی یہ ہے، جیسا کہ جامعہ نعیمیہ لاہور کے محترم مفتی محمد حسین نعیمی مدظلہ نے تحریر فرمایا ہے کہ "شریعت کا منشا یہ ہے کہ سال میں کم از کم ایک بار تمام مسلمان قرآن کریم یعنی اللہ تعالیٰ کے فرامین و احکام کو تازہ کر سکیں اور ہر مسلمان قرآن کریم میں ارشاداتِ الٰہی سے واقف ہو"۔ لیکن یہاں بھی حصولِ مقصد کی راہ میں وہی رکاوٹ سامنے آتی ہے جس کا تذکرہ خطبۂ جمعہ کے ضمن میں کیا جا چکا ہے لہٰذا اگر ہر چار رکعت تراویح سے قبل پڑھی جانے والی آیات کا ترجمہ مع مختصر تشریح کے بیان کر دیا جائے تو نہ صرف یہ کہ اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے بلکہ یہ طریقہ شریعت کے منشا کے عین مطابق بھی ہے۔

(۲) محترم مفتی نعیمی صاحب نے لفظ "تراویح" کی وضاحت فرما کر اس وسوسے کے ازالے کا سامان بھی کر دیا کہ ترجمۂ قرآن کے ساتھ تراویح ادا کرنے سے ہر چار رکعت کے درمیان میں جو وقفہ آجاتا ہے اس سے شاید اس عبادت کی روح مجروح ہوتی ہو۔ مفتی صاحب نے وضاحت فرمائی کہ

اس عبادت کو تراویح کہا ہی اس لئے جاتا ہے کہ اس میں ہر چار رکعت کے بعد وقفہ کرنا مطلوب و محمود ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ ان وقفوں میں اگر قرآن ہی کا بیان ہو اور اس طرح قرآنی آیات کو سمجھنے سمجھانے اور پھر تراویح کی رکعات میں ان آیات کی سماعت ہی میں تمام رات بسر ہوتی ہو اور مقصود یہ ہو کہ قرآن کے انوار اور اس کی برکات کو زیادہ سے زیادہ سمیٹا جا سکے تو یہ وہ چیز ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک فرمان کے مطابق نہایت پسندیدہ ہی نہیں، آخرت میں قرآن کی شفاعت کا حق دار بنانے والی بھی ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

الصیام والقرآن یشفعان للعبد یقول الصیام ای ربّ انّی منعته الطّعام والشّهوات بالنّهار فشفّعنی فیه ویقول القرآن منعته النّوم باللّیل فشفّعنی فیه فیشفّعان.

"روزہ اور قرآن دونوں بندے کی سفارش کریں گے۔ روزہ عرض کرے گا: اے میرے پروردگار! میں نے اس بندے کو کھانے پینے اور نفس کی خواہش پورا کرنے سے روکے رکھا تھا آج میری سفارش اس کے حق میں قبول فرما۔ اور قرآن کہے گا کہ: میں نے اس کو رات کے سونے اور آرام کرنے سے روکے رکھا تھا، پس آج اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما۔ چنانچہ روزہ اور قرآن دونوں کی سفارش اس بندہ کے حق میں قبول فرما لی جائے گی"۔

اس حدیث مبارکہ میں "منعته النّوم باللّیل" کے الفاظ پر توجہ مرکوز کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اگرچہ رمضان المبارک میں راتوں کو جاگ کر عبادت کرنا دن کے روزے کی طرح فرض نہیں قرار دیا گیا لیکن مطلوب یہی ہے کہ انسان ماہِ صیام کی راتیں جاگ کر گزارے اور اس شب بیداری میں بھی محض تسبیحات پھیرتے رہنے یا نوافل کے ڈھیر لگانے سے اس حدیث کا منشا پورا نہیں ہوگا بلکہ مقصود یہ ہے کہ قرآن کی معیت میں رات بسر کی جائے۔ نوافل میں قرآن کا زیادہ سے زیادہ حصہ پڑھنا اور اس کے نور سے اپنے سینے کو منور کرنا یقیناً افضل ہے لیکن اگر قرآن کو سمجھنے سمجھانے پر بھی وقت لگایا جائے تو اس سے بھی مقصود پورا ہوتا ہے جس کا اشارہ "منعه النّوم باللّیل" کے الفاظ میں ملتا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں منشائے شریعت کے مطابق اپنے عمل کو ڈھالنے اور رمضان کی راتوں کو اس طور گزارنے کی توفیق عطا فرمائے کہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ بالا بشارت اور قرآن کی شفاعت کے حقدار بن سکیں۔ آمین۔

غزل

مجاہد کلیم چوہدری

ہر اک جہاں کا وہ خالق ہے، یہ جہاں کیسا
اسی کے سب ہیں، مکاں اور لامکاں کیسا

وفا، خلوص، محبت، سبھی کو ٹھکرا کر
ہوا ہے دوست مرا، مجھ سے بدگماں کیسا

نہ بلبلوں کے ترانے، نہ رقص لالہ و گل
اُجاڑ اُجاڑ سا لگتا ہے گلستاں کیسا

چمن میں کس نے یہ نفرت کی آگ بھڑکا دی
بھری بہار میں، اٹھتا ہے یہ دھواں کیسا

یہ میں نے مان لیا، تو نہیں مرا قاتل
لہو کا، یہ ترے دامن پہ ہے نشاں کیسا

چلا ہوں، لے کے تری دل نواز یادوں کو
نئی جگہ ہے، نہ جانے لگے وہاں کیسا

مرا ضمیر بھی، زخمی کہیں نہ ہو جائے
چلا رہی ہے یہ نشتر، تری زباں کیسا

جگہ جگہ، مری رسوائیوں کے چرچے ہیں
چھڑا ہے ذکر، یہ لوگوں کے درمیاں کیسا

حصار ذات میں قید آدمی، خود اپنے لئے
بنا ہوا ہے، مجاہدؔ وبال جاں کیسا

ہمدردانِ جامعہ کے نام

مکرمی و محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

الحمد للہ، جامعۃ الفلاح بچوں کی دینی تعلیم و تربیت کا جو فریضہ انجام دے رہا ہے اس سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ مقامی اور قرب و جوار سے آنے والی بچیوں کے لئے جامعہ نے دو سال قبل دو بسوں کا انتظام کیا تھا لیکن اس سال ان میں سے ایک بس بالکل معطل ہو گئی ہے۔ تقریباً چھ سو طالبات کو مختلف علاقوں سے لانے اور لے جانے کا بار ایک ہی بس پر پڑ رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بچیوں کو سخت دشواری ہو رہی ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح نے یہ طے کیا ہے کہ وہ اپنی مادر علمی کے لئے ایک بس کا فوری نظم کرے اور اس سلسلے میں انجمن آپ کو بھی دست تعاون دراز کرنے کی دعوت دے رہی ہے۔

آپ سے درخواست ہے کہ اپنے قیمتی وقت کی قربانی دے کر آپ اپنے متعلقین، دوستوں اور احباب نیز رشتہ داروں کو اس کار خیر کی طرف متوجہ فرمائیں اور مخلصانہ رقوم دفتر انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کو ارسال فرما دیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کے اس تعاون کو شرف قبول عطا فرمائے۔

والسلام

جاوید اشرف فلاحی۔ سکریٹری انجمن طلبۂ قدیم، جامعۃ الفلاح

تذکیرات: مولانا سید حامد علی
جمع و ترتیب: مولانا صغیر احسن اصلاحی

روحِ انتخاب

جماعت اسلامی ہند کے زیر اہتمام ایک تربیتی کیمپ منعقدہ ۱۹۵۱ء شانتی درسگاہ رامپور، میں مولانا سید حامد علی صاحب کی مختلف تذکیروں کا خلاصہ، اسی کیمپ کے ایک شریک مولانا صغیر احسن صاحب اصلاحی، استاذ جامعۃ الفلاح کے شکریہ کے ساتھ نذرِ قارئین ہے۔ اس کی ترتیب و صفائی میں امتیاز عالم سلام متعلم عربی چہارم (د جوتی) نے تعاون کیا ہے۔ فجزاہ اللہ۔ (ادارہ)

تمام کمزوریوں کو دور کرنے میں نماز بہترین ذریعہ ہے۔ ویسے روزہ، حج، زکوٰۃ بھی ساری کمزوریوں کو دور کرنے میں مفید ہیں لیکن نماز خصوصیت کے ساتھ ان تمام کمزوریوں کو دور کرنے کا بہترین علاج ہے جو اخلاق و عبادات وغیرہ میں رہتی ہیں۔ ایمان باللہ کے بعد سب سے زیادہ حکم جو قرآن میں دیا گیا ہے وہ اقامت صلوٰۃ ہی ہے جس سے اس فرض کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ نیز اس کی تکرار بھی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ انتہائی اہم ہے یعنی دن میں کئی کئی مرتبہ اور مسلسل ترکِ نماز حدیث کی رو سے کفر ہے۔ قرآن کی ہدایت صرف ان لوگوں کے لئے مخصوص ہے جو ایمان بالغیب کے ساتھ اقامت صلوٰۃ میں بھی پختہ ہوں۔ حضرت عمرؓ نے اپنے تمام عمال کو ہدایت کی تھی کہ وہ اپنے تمام کاموں پر مقدم نماز کو رکھیں جس نے اس کی حفاظت کی۔ اس سے توقع ہے کہ وہ دوسرے تمام کاموں کی پوری حفاظت کرے گا۔ تمام احکام میں خدا نے ابتداء و انتہاء عموماً نماز سے کی ہے۔ سورۂ حج کے آخری رکوع میں شہادتِ حق کا تذکرہ کرتے ہوئے اقامتِ نماز کا حکم دیا گیا ہے یعنی جو کہ شہادتِ حق کا سب سے پہلا مظاہرہ اقامتِ نماز ہے۔ سورۂ مائدہ میں بھی خدا نے اپنی نصرت و معیت کا وعدہ ان لوگوں سے کیا ہے جو نماز قائم کرتے ہیں۔ مشکلات میں نماز قائم کرنی چاہیے تاکہ اللہ سے زیادہ سے زیادہ رجوع کر کے اس کی نصرت و معیت حاصل کی جائے۔ نماز کو بالعموم خدا کی رضا حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ بات صحیح ہے لیکن اسلام میں ہر حکم بجائے خود ذریعہ بھی ہے اور مقصود بھی۔ البتہ مقصود اصلی اول تا آخر خدا کی رضا کا حصول ہے جو حکم جس حیثیت سے بھی اہم ہے

وہ مقصود بھی ہے اور ذریعہ بھی۔ اسلامی حکومت کا قیام بجائے خود مقصود نہیں ہے بلکہ خدا کے حکم کے مطابق یہ اس لئے ضروری ہے کہ ہم اسلام پر پوری طرح عمل کریں چنانچہ ان مکنّاھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ کی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین میں تمکن و اقتدار صرف اس لئے مطلوب ہونا چاہیے کہ وہاں دین کو پوری طرح قائم کیا جائے اور اس اقامتِ دین کے سلسلہ میں پہلی چیز اقامتِ صلوٰۃ ہے۔ اقامت صلوٰۃ میں سب سے پہلی اور ضروری چیز "خشوع" ہے۔ اس کے معنی کمال بندگی کے اظہار کے ہیں جس کا ظہور نہ صرف نماز میں بلکہ مومن کی پوری زندگی میں ہونا چاہیے۔ کیونکہ مومنین کی مستقل صفت ہی "خاشع" بتائی گئی ہے۔ جب تک نماز میں خشوع نہ ہو ساری زندگی میں خشوع نہیں پیدا ہو سکے گا۔ دوسری چیز "ذکر" ہے۔ اس سلسلہ کی ایک چیز تعدیلِ ارکان ہے یعنی باطمینان و سکون نماز ادا کی جائے۔ نیز اقامتِ صلوٰۃ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ پابندیٔ اوقات کا پورا لحاظ کیا جائے جب کہ قرآن کی صاف ہدایت ہے عام طور پر نماز کو بجز عشاء کے اوّل وقت پڑھنا چاہیے البتہ احناف نے صبح کی نماز دیر سے پڑھنے کو ترجیح دی ہے۔

نماز ہمارے تربیتی نظام کا اہم جزء ہے اس لئے سب سے اوّل چیز یہ ہے کہ اسے شعوری طور پر ادا کیا جائے محض روایتی انداز اور عادت کے طور پر ادا نہ کیا جائے یعنی جو کچھ پڑھا جائے اس کا کافی شعور ہو، ایسا نہ ہو کہ کچھ عبارتیں یاد ہیں جنھیں دہرا دیا جا رہا ہے۔ نماز میں حمد کی جاتی ہے، درود پڑھا جاتا ہے، دعا کرتے ہیں، قرآن کی تلاوت ہوتی ہے، یہ سب کچھ بیرونِ نماز بھی کیا جاتا ہے لیکن جو چیز نماز کو غیر نماز سے ممتاز کرتی ہے وہ نماز کی ہیئت ہے جو نہایت خشوع اور بندگی کا مظہر ہے، رکوع و سجود کی حیثیت اور ان کی روح ان حدیثوں سے واضح ہوتی ہے جن میں رکوع و سجود کی متعدد دعائیں وارد ہوئی ہیں۔

ایک مرتبہ آپ سے احسان کی تعریف پوچھی گئی، ارشاد ہوا: ان تعبد اللہ کانک تراہ۔ یہ حدیث نماز کے لئے مخصوص نہیں بلکہ انسانی زندگی میں پوری طرح بندگی کا ظہور مراد ہے لیکن یہ ظہور عام اس وقت ہوگا جب کہ پہلے نماز میں یہ کیفیت پیدا ہو جائے۔ نماز یوں بھی تمام عبادات میں اہم ہے تاہم اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جو نماز میں احسان کی اسپرٹ پیدا کر سکتا ہے وہ دوسری عبادات

باقی صفحہ پر

علم ریاضی میں عربوں کی خدمات کا ایک مختصر جائزہ

ڈاکٹر رشید حسین بھوج پوری

سرزمین عرب نے ایسے باصلاحیت علماء و حکماء کو جنم دیا ہے جن پر رہتی دنیا تک ناز کیا جائے گا۔ عرب کے ان عالموں نے جہاں مختلف علوم و فنون کی طرف توجہ کی اور انھیں فروغ دیا وہیں علم ریاضی میں بھی ان کی خدمات نہایت اہم اور قابل ستائش ہیں۔ انھوں نے علم ریاضی کی قدیم کتابوں کا مطالعہ کیا۔ ان میں موجود خامیوں اور نقائص کی اصلاح کی اور پھر نئے اصول و قواعد جو خاص ان کی اپنی ایجاد تھیں شامل کئے۔ ان کی خدمات کا مختصر جائزہ حسب ذیل ہے:

الجبر والمقابلہ (ALBEBRA)

الجبرا علم ریاضی کا ایک ایسا شعبہ ہے جو صدیوں تک عربوں کی دلچسپی کا مرکز رہا اور جس میں ان کی گراں قدر خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ابو موسیٰ الخوارزمی نے الجبرا پر ایک مستقل کتاب لکھی جس کا نام "کتاب المختصر فی حساب الجبر والمقابلہ" ہے اور جو علم ریاضی کی دنیا میں غیر معمولی اہمیت اور شہرت کی حامل ہے۔ یہ کتاب مامون الرشید کے عہد میں لکھی گئی۔ مشہور یورپی اسکالر کارل بی بوائر (BOYER) نے اپنی کتاب تاریخ ریاضی میں الخوارزمی کی کافی مدح سرائی کی ہے اور اس کی خدمات کو سراہا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"...... اپنی تصنیف کی وجہ سے الخوارزمی کا نام انگریزی زبان کا ایک عام فہم لفظ بن گیا ہے۔ اپنی سب سے اہم کتاب "الجبر والمقابلہ" کے ذریعہ اس نے ہمیں ایک گھریلو اصطلاح دی ہے...... اس کے اسی عنوان سے لفظ "الجبرا" (ALGEBRA) مشتق ہے اور یہ اسی کتاب کی دین ہے کہ یورپ نے آگے چل کر علم ریاضی کے اس شعبے سے آشنائی حاصل کی" [1]

الخوارزمی کی یہ کتاب ابتدائی عملی ریاضی سے بحث کرتی ہے۔ یہ ایک مقدمہ اور تین ابواب پر مشتمل ہے اور اس کے تینوں ابواب الجبرا، ہندسہ اور وراثت سے متعلق مسائل اور ان کے حل کے بیان میں ہیں۔

[1] C-B BOYER, A HISTORY OF MATHEMATICS, NEW YARK, 1968, P 251-252

اس کتاب کا عربی سے لاطینی میں ترجمہ ہوا اور پھر لاطینی ترجمہ کے ذریعہ یورپی عالموں کو اس سے واقفیت ہوئی اور انھوں نے نہایت دلچسپی کے ساتھ اس کا مطالعہ کیا۔ الخوارزمی نے نامعلوم VARIABLE کے لئے ایک لفظ "شئی" کسی QUANTITY کے SECOND POWER کے لئے "مال" SQUARE ROOT کے لئے "جذر" اور CONSTANT TERM کے لئے "درہم" کا استعمال کیا ہے۔

خوارزمی کے آغاز کردہ کام کو ثابت ابن قرہ (۹۰۱ — ۸۳۶) نے نہ صرف یہ کہ اسے جاری رکھا، مزید فروغ بھی دیا۔ اس نے الجبرا پر ایک رسالہ لکھا جس میں تیسرے درجے کی مساوات کو ہندسے کے سہارے حل کیا گیا ہے۔ اس کا نام "قول فی تصحیح مسائل الجبر بالبراہین الہندسیہ" ہے۔

INDELERMINATE EQUATION یعنی غیر معین مساوات میں بھی عربوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ ابو کامل (دسویں صدی) کی تصنیف "کتاب الطرائف فی الحساب" اس کی بہترین مثال ہے۔ یہ کتاب مخطوطے کی شکل میں محفوظ ہے۔ اسی مصنف کی ایک دوسری کتاب بھی موجود ہے جس کا متن بھی ALGEBRIC ہے اور اس میں چوتھے درجے کی مساوات سے بحث کی گئی ہے۔ ابو کامل سب سے پہلا عربی ریاضی داں ہے جس نے دو سے زیادہ POWER کا نہایت آسانی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ اس کی تصنیف میں x^5 ، x^6 ، x^7 ، x^8 وغیرہ بکثرت نظر آتے ہیں۔ الخوارزمی، اقلیدس اور ہیرن (HERON) کی کتابوں کے گہرے مطالعہ نے ابو کامل کو اتنا باصلاحیت بنا دیا تھا کہ وہ SOPHISTICATED GEOMETRIC ALGEBRA کو SET-UP کر سکتا تھا۔ اس کے کارنامے الخوارزمی سے زیادہ وسیع اور اقلیدس سے زیادہ عملی ہیں۔ اپنی خدمات کے ذریعہ اس نے الجبرا کے باقاعدہ ارتقاء میں بہت زیادہ معاونت کی ہے۔

عربی ریاضی دانوں نے اپنے عہد میں استعمال کئے جانے والے الجبرا کے بہت سارے مسائل اور ان کے اصولوں کی اصلاح بھی کی ہے۔ اس ضمن میں غیاث الدین الکاشی (۱۴۳۶ء) کی مشہور کتاب "مفتاح الحساب" کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ اپنی کتاب میں اس نے چوتھے درجہ کی مساوات کے لئے کچھ ایسے اصول وضع کرنے کا دعویٰ کیا ہے جن سے قدماء و معاصرین دونوں ناواقف تھے۔ [1]

[1] DICTIONARY OF SCIENTIFIC BIOGRAPHY VOL-7, P-257.

حساب (ARITHMETIC)

حساب علم ریاضی کی ایک شاخ ہے جس میں اعداد سے بحث ہوتی ہے اسی لئے اسے "علم العدد" بھی کہتے ہیں۔ اس کی طرف عربوں نے خاص توجہ دی اور کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ہندوستان اور یونان کی تحریروں کا سہارا لیا۔ اس ضمن میں ان کا اہم ترین کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مغربی یورپ کو گننے کے ہندوستانی طریقے (HINDU SYSTEM OF NUMERATION) سے روشناس کیا۔ عرب ہی وہ درمیانی کڑی ہیں جنھوں نے دیگر علوم کی طرح ہندوستانی گنتی کے طریقے کو بھی یورپ سے ملایا۔ چنانچہ الخوارزمی نے (HINDU NUMERATION) پر ایک کتاب لکھی جس کا عربی نام غیر واضح ہے۔ ممکن ہے اس کا نام "کتاب العدد الہندی" ہو۔ اس کتاب کا لاطینی ترجمہ موجود ہے جس کا عنوان ALGORITHMI DE NUMERO INDORUM ہے۔ اس میں ہندوستانی ہندسے ۱ سے ۹ اور صفر، جمع و تفریق، ضرب و تقسیم وغیرہ کے علاوہ COMON AND SEXAGESIMAL FRACTIONS اور جذر نکالنے کے طریقے کا بھی بیان ہے۔ الخوارزمی نے ہندوستانی طریقے کے برخلاف جمع و تفریق کو بائیں طرف سے شروع کیا ہے۔ خوارزمی کے علاوہ دوسرے عرب ریاضی دانوں نے علم حساب کی پیچیدگیوں اور دشواریوں کو سہل اور آسان بنانے کی بے حد کوششیں کیں اور بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے۔

عربوں کی ایک اور اہم خدمت "عدد متحابہ" (AMICABLE NUMBER) معلوم کرنے کے سلسلے میں ہے۔ ثابت ابن قرہ پہلا عربی ریاضی داں ہے جس نے عدد متحابہ معلوم کرنے کے اصول وضع کئے۔ اس ضمن میں اس کی کتاب "مقالہ فی استخراج الاعداد المتحابہ بسہولۃ مسلک الی ذلک" کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اس کی دوسری کتاب بھی قابل قدر ہے جس کا نام "کتاب فی تالیف النسب" ہے اور یہ COMPOSITE RATIOS کے بیان میں ہے۔

عملی علم حساب (PRACTICAL ARITHMETIC) پر ابوالوفا کی کتاب کافی مشہور ہے۔ اس کا عنوان "کتاب فی ما یحتاج الیہ الکتاب والعمال" ہے اور یہ سات ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کے تین ابواب ضرب، تقسیم اور پیمائش وغیرہ سے متعلق ہیں اور چار ابواب ایسے مسائل اور ان کے حل کے بیان میں ہیں جن کی عام طور سے روزمرہ کی زندگی میں ضرورت پڑتی ہے مثلاً کام کی اجرت و

تنخواہ، تعمیر، ترقی، تخمینے، اناج و دیگر اشیائے خوردنی کے ادل بدل کرنے وغیرہ۔ اسی طرح ابوالوفا نے ایسے اصول وضع کئے جو تاجروں، شعبۂ مالیات میں کام کرنے والے کلرکوں اور زمین کی پیمائش کرنے والوں کے لئے کافی معین و مفید ہے۔ اس نے اپنے عہد میں رائج کچھ اصول و قواعد کے نقائص کو ظاہر کیا اور ان کی تصحیح بھی کی۔

ہندسہ اور علم المثلثات

ہندسہ یعنی جیومیٹری علم ریاضی کی اہم ترین شاخ ہے اور یہ لفظ یونانی زبان میں بمعنی "زمین کی پیمائش" کے مستعمل ہے۔ "انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" کی رو سے لفظ ہندسہ فارسی مصدر "انداختن" یا "اندازیدن" سے مشتق ہے جس کے معنی پھینکنا، ناپنا یا پیمائش کرنے کے ہیں۔ عربوں نے علم ریاضی کے اس شعبے کو بہت زیادہ ترقی دی تھی۔ انھوں نے یونانی عالم اقلیدس کی کتاب (ELEMENTS) اور ہندوستانی کتاب (SIDDHANTAS) سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ہندسہ پر ابوالوفا نے ایک کتاب بعنوان "کتاب فی ما یحتاج الیہ الصانع من الاعمال الہندسیہ" لکھی ہے اس میں GEOMETRIC CONSTRUCTIONS کے بنیادی مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس میں جیومیٹری کے بہت سارے مسائل کو پرکار کے ایک ہی پھیلاؤ SINGLE SPAN OF A COMPASS کے سہارے حل کیا گیا ہے۔ اس میں ایک دلچسپ بات یہ دیکھنے میں آتی ہے کہ اس طریقے سے حاصل کیا گیا نتیجہ اس نتیجے سے زیادہ صحیح ہوتا ہے جو پرکار کے پھیلاؤ (COMPASS SPENING) کی تبدیلی سے حاصل کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نشاۃ ثانیہ کے یورپ میں اسے بہت زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔

علم المثلثات (TRIBONOMETRY) میں محقق نصیر الدین طوسی (تیرہویں صدی عیسوی) کی خدمات نہایت اہم ہیں۔ اس نے ضابطہ مینیلاؤس اور علم الفلکیات (MENELAUS THEOREM AND ASTRONOMY) کی مدد کے بغیر علم المثلثات کو ترقی دی۔ طوسی کے زمانے تک علم الہیئت اور علم المثلثات دو الگ الگ چیزیں نہ تھیں لیکن اس نے علم المثلثات کو علم ہیئت سے علیحدہ ایک باضابطہ BRANCH OF MATHS کا مقام عطا کیا۔ THEORY OF PARALLELS پر بھی عربوں نے بہت کام کئے ہیں۔ اس ضمن میں عمر خیام کا کام کافی اہمیت کا حامل ہے۔

مذکورہ تفصیل سے یہ بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ عربوں کو علم ریاضی سے خاص دلچسپی تھی اور اس کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس میں انھوں نے اپنے وضع کردہ اصول و قواعد شامل نہ کئے ہوں۔ ●●

محمد اسمٰعیل فلاحی

جامعہ کے لیل ونہار

خطاب امیر حلقۂ یوپی

مولانا رفیق احمد قاسمی صاحب امیر جماعت اسلامی ہند حلقۂ یوپی ۲۲ جون ۱۹۸۶ء کو بلریاگنج تشریف لائے۔ جامعہ سے قدیم امیر حلقہ کا تعلق گہرا اور دیرینہ ہے۔ وقت کی کمی اور مشاغل کی زیادتی کے باوجود موصوف نے ذمہ داران جامعہ کی خواہش کا احترام کیا اور جامعہ آکر شعبۂ اعلیٰ کے اساتذہ وطلبہ سے خطاب فرمایا۔

امیر حلقہ: اسلام دشمن سازشوں پر گفتگو کر رہے تھے، فرمایا: بڑی عیاری اور چالاکی کے ساتھ مذہب وسیاست کو ایک دوسرے سے الگ کیا گیا، کہا گیا کہ مذہب ایک مقدس شے ہے اور سیاست ایک خالص دنیاداری کا کام۔ اہل مذہب روحانیت سے تعلق رکھیں اور اہل سیاست حکمرانی کریں۔

مولانا نے بتایا اسلام زندگی کے تمام گوشوں کے بارے میں ہدایت دیتا ہے۔ یہ ایک جامع دین ہے۔ امانت ودیانت جیسی اخلاقی باتیں تو مذاہب میں پائی جاتی ہیں لیکن کوئی مذہب سیاسی ومعاشی ہدایت نہیں رکھتا۔ یکساں سول کوڈ کا مسئلہ صرف ہمارے ہی لئے وجہ پریشانی بنا ہوا ہے، کسی ہندو کو اس سے کوئی اضطراب کیوں نہیں لاحق ہوتا۔ اس کی اس کے علاوہ اور کیا وجہ ہے کہ ان کے پاس اس سلسلہ میں اصول ہی نہیں ہیں۔ ہندو دھرم میں عورت کا یہ حال تھا کہ اگر بیوہ ہو جاتی تو شوہر کے ساتھ ستی ہوتی۔ راجہ رام موہن رائے نے اس کے خلاف تحریک شروع کی، قربانیاں دیں، تو انھیں کامیابی بھی ہوئی۔ عورت ہندو دھرم کی رو سے دوسری شادی کا حق نہیں رکھتی۔ تناسب کے اعتبار سے دیکھا جائے تو جہیز کے بنیاد پر برادران وطن کے یہاں عورتیں زیادہ جلائی جاتی ہیں۔ ہندو عورت اپنی مسلمان پڑوسن کو رشک سے دیکھتی ہے کہ اس کو کیا عزت ملی اور کیسا احترام حاصل ہے۔ یہ صورت حال ہے۔ ایمانداری کا تو تقاضا تھا کہ اپنی ناک کا علاج کیا جاتا لیکن اس کے بجائے دوسرے ہی کو نکٹا ثابت کرنے کی کوشش جاری ہے۔ مسلم پرسنل لا ہو یا مسلم عورتوں کے سلسلہ میں اسلام کے عادلانہ قوانین پر اعتراضات کے پس پردہ یہی ذہنیت کام کرتی ہے اور جس کا شاہ بانو کیس میں کھل کر مظاہرہ ہوا تھا۔

مولانا نے یہ بات کھل کر بڑے دو ٹوک انداز میں واضح کی کہ اسلام اور صرف اسلام ہی زندگی کے تمام مسائل کا صحیح حل اپنے دامن میں رکھتا ہے۔ وہ دین وسیاست میں تفریق کا قطعی قائل نہیں۔ (طلبہ سے مخاطب ہوتے ہوئے) آپ اٹھئے۔ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا اور وقت ہمیشہ یکساں نہیں رہتا۔ حالات بدلتے رہتے ہیں، ایک طرف ۱۹۴۷ء میں عالم یہ تھا کہ لوگ جان بچانے کے لئے مرتد ہو رہے تھے اور آج یہ حال ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے لئے آمادہ و تیار نظر آتے ہیں۔ آپ کو اپنے اندر قائدانہ صلاحیت پیدا کرنی ہے، تحریک کو لے کر آگے بڑھنے کا جذبہ ہونا چاہئے، یہ تفریق مناسب نہیں کہ یہ وکیل صاحب کا کام ہے اور یہ مولانا صاحب کا کام۔ اسلامی سیاست کسے کہتے ہیں؟ اسلام دنیا کے مسائل کیسے حل کرتا ہے، اسلام کو کس انداز سے پیش کیا جائے اس میں آپ کو مہارت حاصل کرنی ہے۔

اس گفتگو کے بعد طلبہ کی طرف سے بعض سوالات آئے جن کا جواب مولانا نے دیا۔ ایک طالب علم نے کہا یہ صحیح ہے کہ اسلام دین وسیاست میں تفریق کا قائل نہیں ہے لیکن الیکشن کے سلسلہ میں ماضی کے برخلاف جماعت کے موجودہ فیصلہ کی کیا توجیہ ہے؟

امیر حلقہ نے کہا حالات بدلتے رہتے ہیں۔ ایک وقت تو وہ تھا جب کہ جان بچانا بھی مشکل ہو رہا تھا اور الحمد للہ آج ایسا نہیں ہے اب دفاع کے بجائے اقدامی پوزیشن ہے۔ دوسرے ماضی میں علمائے کرام اور سی پی آئی کے علاوہ ہمیں کوئی نہیں جانتا تھا اور اب صورت حال یہ نہیں ہے۔ حالات کی تبدیلی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ جشن کے موقع پر جماعت کے ذمہ داران کے نام ان کی ذمہ دارانہ حیثیت میں دعوت نامے آئے، پگڑیاں دی گئیں، اور وہاں جماعت کا مکتبہ لگانے کی اجازت ملی۔ اس کے ساتھ یہ حقیقت ہے کہ نظام باطل کے غلط اثرات ہمارے لئے بھی اتنے ہی نقصان دہ ہیں جتنے دوسروں کے لئے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ عوام الناس کو اس بارے میں صحیح مشورہ دیں۔

بابری مسجد کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں امیر حلقہ نے وضاحت کی کہ بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے ساتھ ہم ہیں۔ ہم عدالت سے اس کا فیصلہ چاہتے ہیں، ہمارے پاس دستاویزی ثبوت ہیں، ہندوؤں کے پاس کوئی دلیل اور ثبوت نہیں ہے اسی لئے بالا صاحب دیورس وغیرہ عدالت کی طرف سے

اس معاملہ میں فیصلہ کرائے جانے کے مخالف ہیں۔

ایس آئی او اور ایس آئی ایم کے انضمام سے متعلق ایک سوال کے جواب میں مولانا نے فرمایا بڑی اچھی خواہش ہے۔ ہم نے تین سال تک لگاتار اس سلسلہ میں کوشش کی ہے لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ ہم سب دعا بھی کریں اور اس کے لئے کوشش بھی۔

مولانا امانت اللہ صاحب اصلاحی کی آمد

مدرسۃ الاصلاح کے مایہ ناز فرزند مولانا محمد امانت اللہ صاحب اصلاحی جامعہ تشریف لائے۔ مولانا نائیجیریا میں دعوت کے محاذ پر سرگرم عمل ہیں۔ مولانا کا خاص موضوع قرآن ہے۔ جب بھی آتے ہیں تشنگان علم مولانا سے اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ انفرادی و اجتماعی ملاقات کے علاوہ مولانا کا ایک خطبۂ جمعہ اور دو تذکیری بھی ہوئیں۔ "حیات نو" کے لئے انٹرویو لینا چاہا مولانا تیار نہیں ہوئے۔ بڑی کوششوں کے بعد طلبہ و اساتذہ کے طے شدہ پروگرام میں انٹرویو کے سوالات کی روشنی میں مولانا گفتگو کرنے پر رضامند ہو گئے۔ سوالات دو طرح کے تھے ایک کا تعلق نائیجیریا کے حالات، دعوتِ اسلامی کے کام اور تحریک سے تھا دوسری نوعیت کے سوالات قرآن سے متعلق تھے۔ مناسب موقع پر ان شاء اللہ ہم اسے شائع کریں گے۔

توسیعی لکچر

طلبہ کے اندر علمی استعداد بڑھانے کے لئے وقتاً فوقتاً مختلف موضوعات پر مختلف اساتذہ فن کے ذریعہ لکچر کا اہتمام کیا جاتا رہا ہے۔ ۳۰ جولائی ۸۹ء کو اسی طرح کا ایک پروگرام معاشیات کے موضوع پر رکھا گیا۔ ڈاکٹر عبد العظیم صاحب اصلاحی، استاذ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور رکن مجلس مشاورت ششماہی "علوم القرآن" نے "اسلامی معاشیات پر کیا کام ہوا کیا ہو رہا ہے اور ہم کیا کر سکتے ہیں" کے موضوع پر سیر حاصل بحث کی۔ موصوف جامعہ سے متصل ایک گاؤں بنگاؤں پور کے رہنے والے ہیں، جامعہ سے گہرا تعلق ہے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے اسی جامعہ سے (جبکہ یہ ایک چھوٹے مکتب کی شکل میں تھا) حاصل کی۔ ڈاکٹر صاحب نے طلبہ کو مشورہ دیا کہ یہ دور اختصاص اور کمال کا ہے۔ کسی ایک علم میں انھیں اختصاص پیدا کرنا چاہئے اور اختصاص وسیع مطالعہ اور جہد مسلسل کے بغیر محض سندوں کے حصول سے نہیں پیدا ہوتا۔

ڈاکٹر اسمتھ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ معاشیات کے بابائے آدم ہیں ڈاکٹر عبد العظیم صاحب

نے اس خیال کو غلط قرار دیا اور بتایا کہ مسلم دانشور بہت پہلے سے اس پر بہت کچھ لکھتے چلے آئے ہیں۔ فقہ اور قضا وغیرہ کی کتابوں سے طلبہ کو اسلام کی معاشی تاریخ مرتب کرنے کا مشورہ دیا کہا کہ اگر آپ صرف اتنا کر سکیں کہ فقہ کی کتابوں میں جہاں جہاں قیمت، نفع، اجرت، زمینوں کا کرایہ وغیرہ زیر بحث آئے ہیں، ان کی رپورٹ تیار کر دیں تو یہ ایک بڑا کام ہوگا۔

صدر ایس آئی ایم جامعہ میں

۲۳ جون ۱۹۸۹ء کو اسٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ آف انڈیا کے صدر جناب اشرف جعفری صاحب جامعۃ الفلاح تشریف لائے۔ موصوف نے جامعہ کو قریب سے دیکھا۔ "موجودہ نظام تعلیم اور ہماری ذمہ داریاں" کے موضوع پر اظہار خیال کیا۔ انھوں نے سیکولر نظام تعلیم کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا لادینی نظام تعلیم سے مسائل میں اضافہ ہی ہوگا، مسائل کبھی حل نہیں ہوں گے۔ ان اداروں میں اگر مذہب و اخلاق کی تعلیم دی بھی جاتی ہے تو دائرہ کی شکل میں، جس کی وجہ سے معصوم بچوں کا ذہن پراگندہ ہو جاتا ہے۔ صدر ایس آئی ایم نے اس تعلیم کو تعلیم قرار نہیں دیا جس سے انسان اپنے خالق کو نہ پہچان سکے اور آخرت میں جوابدہی کا احساس نہ پیدا ہو۔

نائب ناظم جامعہ اور صدر انجمن عازم بیت اللہ

جناب ڈاکٹر خلیل احمد صاحب نائب ناظم جامعہ اور مولانا اسلم غازی صاحب فلاحی صدر انجمن طلبہ قدیم حج بیت اللہ کو گئے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے حج کو شرف قبول بخشے۔ نائب ناظم جامعہ نے اپنی عدم موجودگی میں اپنا قائم مقام جناب عبد المتین صاحب مسعود کو بنایا ہے جو کافی سرگرم عمل ہیں۔ صدر انجمن اپنا قائم مقام جناب مولانا رحمت اللہ اثری صاحب فلاحی کو بنا کر اس مبارک سفر پر روانہ ہوئے ہیں۔

عید الاضحی کی تعطیل ختم

عید الاضحی میں ایک ہفتہ کی تعطیل ہوتی ہے، بہت سے طلبہ نے گھر جانے کے مقابلہ میں جامعہ میں رہنا زیادہ پسند کیا اور چھٹی میں لائبریری سے خوب استفادہ کیا۔

ملک کے مختلف علاقوں کے لوگ جامعۃ الفلاح میں اپنی قربانی کرانا پسند کرتے ہیں جس سے طلبہ اور آس پاس کے مستحقین استفادہ کرتے ہیں اس سال بھی بہت سے لوگوں نے اپنی قربانیاں جامعہ میں

کرائیں اور اپنی قربانی کے ثواب کو دو چند کیا۔

جمعیۃ الطلبہ کا انتخاب

جامعۃ الفلاح نے طلبہ کی علمی وعملی صلاحیت میں اضافہ کے لئے طلبہ کی ایک جمعیت، جمعیۃ الطلبہ اور طالبات کی ایک جمعیت، جمعیۃ الطالبات قائم کی ہے۔ یہ جمعیۃ الطلبہ اور جمعیۃ الطالبات، طلبہ و طالبات کے لئے بہترین تربیت گاہ ہیں۔ اس سال طلبہ نے مختلف شعبوں کے لئے درج ذیل ذمہ دار منتخب کئے ہیں:

سکریٹری جمعیۃ الطلبہ: محمد یٰسین گجیلی، معتمد لائبریری: محمد اکرم، معتمد عربی خطابت برائے عربی پنجم تا عربی ہفتم: محی الدین، معتمد عربی خطابت برائے عربی اول تا عربی چہارم: نسیم احسن، معتمد اردو خطابت برائے عربی ششم تا عربی ہفتم: شاہد بدر، معتمد اردو خطابت برائے عربی پنجم: عبد الرب ثاقب، معتمد اردو خطابت برائے عربی چہارم: مشتاق احمد کنجوی، معتمد اردو خطابت برائے عربی سوم: صداقت حسین، معتمد اردو خطابت برائے عربی دوم: اکرام الرحمٰن، معتمد اردو خطابت برائے عربی اول: عبد الحسیب، معتمد انگریزی خطابت برائے عربی پنجم تا عربی ہفتم: نسیم اختر، معتمد انگریزی خطابت برائے عربی اول تا عربی چہارم: لیاقت علی، معتمد طعام: مشیر حسین سنبھلی، معتمد شوریٰ: شمس نوید بدایونی، معتمد خدمت خلق: نسیم اختر سہرسہ، معتمد باغبانی: نظام الدین کشمیر، معتمد کھیل: غیاث الدین، معتمد رسائل وجرائد: ریاض احمد دربھنگہ، معتمد صفائی: نبی سرور۔ معتمد اردو خطابت برائے ہشتم و ہفتم ثانوی: عبد المتین عباسی بدایونی۔ معتمد اردو خطابت برائے ششم ثانوی: مجاہد حسین جمالی گیاوی۔

جمعیت نے کام شروع کر دیا ہے۔ جمعیت کا سشن اب عید الاضحیٰ سے عید الاضحیٰ تک ہوا کرے گا۔ اس سے کئی فائدے ہوں گے۔

طلبہ رمضان بعد جب گھروں سے واپس آتے ہیں جامعہ میں داخلہ وغیرہ کی مشغولیت رہتی ہے اور طلبہ دوسرے دنوں کے مقابلہ میں نسبتاً زیادہ خالی رہتے ہیں۔ اگر سشن عید الاضحیٰ تک چلے تو جامعہ کھلنے کے فوراً بعد ہی سے طلبہ لائبریری وغیرہ سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ ان کی سرگرمیاں بدستور جاری رہیں گی اور داخلے کے لئے آنے والے مہمان ان کی سرگرمیوں سے واقف ہو سکیں گے۔ شوال میں انتخاب ہوتا ہے تو نئے طلبہ نہ کام کی نوعیت سے واقف ہوتے ہیں اور نہ افراد کی صلاحیتوں سے، جس کی وجہ سے ان کے لئے انتخاب میں حصہ لینا مشکل ہوتا ہے۔ دو ماہ بعد عید الاضحیٰ کے موقع پر انتخاب ہونے کی صورت میں وہ کام کی نوعیت اور افراد کی صلاحیت دونوں سے واقف ہو سکیں گے۔

شعبان میں امتحان کا زمانہ ہوتا ہے۔ مقالات کی تیاری اور مشغولیت کا وقت ہوتا ہے۔ جمعیت کا چارج دینے کے لئے طلبہ کی تیاری کرنی ہوتی ہے جس سے امتحان متاثر ہوتا ہے۔ عید الاضحیٰ کے زمانہ میں شعبان کے مقابلہ میں نسبتاً کم مشغولیت رہتی ہے۔ اس زمانہ میں چارج دینا اور لینا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ شعبان میں سشن ختم ہونے کی صورت میں جملہ شعبہ جات کا چارج دینے کی تیاری میں ایک ماہ پہلے طلبہ سے لائبریری کی کتابیں جمع کرا لی جاتی ہیں حالانکہ ان کتابوں کی امتحان میں ضرورت پڑتی ہے۔

امید ہے ان پہلوؤں سے عید الاضحیٰ سے عید الاضحیٰ تک کا سشن زیادہ مفید ہو سکے گا۔

جمعیۃ الطالبات کا انتخاب

درج ذیل طالبات جمعیۃ الطالبات کی ذمہ دار منتخب ہوئی ہیں۔ ان کا بھی سشن آئندہ سے عید الاضحیٰ سے عید الاضحیٰ تک ہوا کرے گا۔

عارفہ، صدر جمعیۃ الطالبات۔ گلستاں بانو: نائب صدر۔ تمکین بانو، سکریٹری۔ قیصر بانو، نائب سکریٹری۔ شاکر النساء، اناؤنسر۔ شاداں بانو، نائب اناؤنسر۔ افضل النساء، کارکن شعبہ اجتماع۔ افشاں، صحافتی معاون کارکن۔ فرح بانو، کارکن اجتماع۔ رعنا شیریں، معاون کارکن۔

نئی تقرریاں

اس سال جامعہ میں نو افراد کا تقرر عمل میں آیا ہے۔ اس وقت جامعہ کے اسٹاف میں ۱۴۷ ار اساتذہ وغیر اساتذہ ہیں۔

جامعہ میں مہمان خانہ معمولی نوعیت کا ہے روزانہ مہمان آتے رہتے ہیں: انھیں بڑی دشواریوں کا سامنا رہتا ہے۔ جناب محمد اسلم صاحب کو مہمان خانہ کا انچارج مقرر کیا گیا ہے۔ امید ہے اس سے مہمانوں کو سہولت اور راحت حاصل ہوگی۔

کتب خانہ میں اب تک مولانا عبد الرحمٰن خالد صاحب فلاحی تنہا تھے۔ اب اسے مزید منظم کرنے اور زیادہ سے زیادہ استفادہ کا موقع فراہم کرنے کی غرض سے امیر الحسن صاحب فلاحی کو عبد الرحمٰن خالد صاحب کا معاون مقرر کیا گیا ہے۔

دورۂ تدریب میں شرکت

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی جانب سے ہندوستان میں مدارس کے فارغ طلبہ واساتذہ کی تدریب (تربیت و ٹریننگ) کے لئے تین سالوں سے تدریبی کیمپ لگ رہا ہے۔ سب سے پہلا کیمپ

جامعہ سلفیہ بنارس میں لگا تھا۔ اس تدریب کے مقاصد میں یہ بات شامل ہے کہ اس میں ممتاز ہونے والے طلبہ کو مزید تعلیم کا موقع دیا جاتا ہے۔ اس میں شریک ہونے والوں اور تدریب سے مشاہدہ کرنے والوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جامعۃ الفلاح کے طلبہ بہت نمایاں اور ممتاز رہے اور انھوں نے اچھی پوزیشن حاصل کی اور اساتذہ نے ان کی صلاحیت وصالحیت وغیرہ پر اطمینان کا بھی اظہار کیا لیکن نامعلوم اسباب کی بنا پر مزید تعلیم کے انتخاب میں وہ نہیں آسکے جبکہ دوسرے طلبہ جو ان کے ہم پلہ اور بہتر نہیں تھے، انھیں مزید مطالعہ اور جامعہ اسلامیہ میں داخلہ کا موقع ملا۔

دوسری تدریب جامعہ دارالسلام عمرآباد میں ہوئی، اس میں بھی ہمارے طلبہ ممتاز آئے اور مختلف مراحل سے گزر کر انٹرویو کے لئے عمرآباد جاچکے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو جلد ہی وہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ پہنچ جائیں گے۔

یہ تیسرا تربیتی کیمپ بھی عمرآباد میں لگا ہوا ہے۔ جامعۃ الفلاح سے عبدالبر فلاحی، ولی اللہ سعیدی فلاحی، امیر فیصل فلاحی، عبیدالرحمن فلاحی اور فیروز فلاحی شرکت کے لئے گئے ہوئے ہیں۔ امید ہے اس سال بھی سابقہ روایت قائم رہے گی۔

بس کی مہم

ہم نے اس سے پہلے عرض کیا تھا کہ جامعہ کے پاس دو مستقل بسیں ہیں جو طالبات کی کثرت کی بنا پر خود انھیں لانے لے جانے کے لئے ناکافی ہیں۔ چھوٹے بچوں کا مسئلہ الگ ہے۔ ہمارے طلبہ سائیکلوں اور جیپ وغیرہ سے آجاتے ہیں۔ ان دو بسوں کے علاوہ پہلے ہی مزید ایک بس کی فوری ضرورت تھی کہ اس سال ان دو بسوں میں سے ایک بالکل ناکارہ ہوکر بیٹھ چکی ہے اور کسی طرح سے استعمال کے قابل ہی نہیں رہ گئی ہے ایک ہی بس کو دونوں کا بوجھ ڈھونا پڑ رہا ہے اور اسے کئی چکر لگانے پڑ رہے ہیں، نتیجتاً طالبات کا کافی وقت ضائع ہوتا ہے۔ جب دن چھوٹا ہوگا تو ایک بس سے انھیں گھر واپس جانے میں عشاء کا وقت ہوجایا کرے گا۔ قارئین اندازہ کرسکتے ہیں کہ کتنی زحمتوں کا سامنا ہے۔ بسوں اور جیپ وغیرہ میں بھیڑ کا جو عالم ہوتا ہے اور شاذ ونادر جس طرح چلتا ہے کوئی غیور اور شریف آدمی کیسے گوارہ کرسکتا ہے کہ اس کی بہن بیٹی اس حالت میں آئیں جائیں۔ ان حالات کے پیش نظر ذمہ داران جامعہ کے تعاون کے لئے ابھرتے طلبہ قدیم نے ایک بس کی فراہمی اپنے ذمہ لی ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ہم نے اپنی مہم تیز سے تیز تر

کر دی ہے۔ ۳۰ جولائی ۱۹۸۹ء کو مقامی فلاحی برادران کی ایک نشست ہوئی جس میں اس سلسلہ میں نقشہ کار اور لائحہ عمل مرتب کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل اور مخیر حضرات کے تعاون سے ہم امید رکھتے ہیں کہ ہمیں رب العزت کامیابی عطا کرے گا۔ اس سلسلہ میں قاری قربان احمد صاحب اور ماسٹر شہنواز صاحب پر مشتمل ایک وفد بمبئی بھی گیا ہوا ہے۔

پنکھے

ان ہی کالموں میں ہم نے بجلی کے پنکھوں کی ضرورت کا تذکرہ کیا تھا۔ اللہ کا فضل ہے کہ طلبہ قدیم اور بعض اہل خیر حضرات کے تعاون سے کئی قسطوں میں جامعہ کو پنکھے حاصل ہوئے ہیں اور اب تک قسم الطالبات (شعبہ نسواں)، طلبہ منزل، اور بعض درسگاہوں میں یہ پنکھے لگ چکے ہیں۔ قاسمیہ منزل، درسگاہ، مطبخ اور مسجد میں لگنا باقی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انشاء اللہ اس کی سبیل بھی پیدا کرے گا۔

دارالشفاء کا قیام

عرصہ سے ضرورت محسوس ہورہی تھی کہ جامعہ کے اندر شفاخانہ ہو، طلبہ کو باہر جانا نہ پڑے۔ اللہ کا فضل ہے، محدود پیمانہ پر ہی اس کا نظم کیا گیا ہے۔ دو ڈاکٹروں نے اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ چنانچہ محمد داؤد صاحب قسم الطالبات میں اور جناب ڈاکٹر [illegible] احمد صاحب قسم الطلبہ میں پابندی سے وقت دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں اور خلوص کو

وفیات

برادر مکرم حافظ مصطفیٰ فلاحی رنجور لکھتے ہیں کہ ان کی اہلیہ محترمہ ایک طویل مدت تک بیمار رہنے کے بعد یکم جون ۱۹۸۹ء کو ان سے اور بچوں سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحومہ نے اپنے پیچھے ایک سات سالہ بچہ اور ایک بالکل چھوٹی بچی چھوڑی ہے۔

عبدالمالک صاحب فلاحی استاذ جامعہ کی والدہ ۱۹ جون ۱۹۸۹ء کو اسّی سال کی عمر میں انتقال کرگئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ نماز جنازہ میں شرکت کیلئے بہت سے طلبہ و اساتذہ علاء الدین پٹی پہنچے۔ مرحومہ مولانا عبدالحسیب صاحب فلاحی کی اپنی چچی تھیں۔ سادگی پسند، تصنع وبناوٹ سے کوسوں دور، غریب پرور، رحم دل، شاکر وصابر اور بچوں سے بے حد پیار ومحبت کرنے والی۔

جناب عبدالحکیم اور حکیمی صاحب کے خسر محترم جناب عبدالقدوس صاحب ۳ رجون ۱۹۸۹ء کو رحلت کرگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم نماز روزہ کے پابند تھے۔ آخری عمر میں دماغی توازن بگڑ گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ انکی مغفرت فرمائے، انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور پسماندگان کو بہترین بدلہ اور صبر جمیل دے۔

نائب ناظم جامعہ سفرِ حج پر

ترتیب: مولانا محمد عمران صاحب فلاحی، نائب صدر مدرس جامعۃ الفلاح

اسلام کے بنیادی ارکان میں سے حج ایک اہم رکن ہے۔ اس کی ادائگی ہر صاحب استطاعت پر فرض ہے۔ جناب ڈاکٹر خلیل احمد صاحب نائب ناظم جامعہ ان خوش نصیبوں میں سے ہیں جو اس فرض سے سبکدوش ہو چکے ہیں اب پھر وہ اپنے ضعیف والد اور اہلیہ کے طفیل اس کی سعادت پا رہے ہیں۔ (اللہ تعالیٰ ان کے حج کو قبول فرمائے اور ہم سبھوں کو اس کی توفیق دے)۔ موصوف نے شروع ہی سے جامعہ کی خدمت کی ہے بلکہ جب یہ گاؤں کا ایک مکتب تھا اس وقت سے آپ نے ایک عظیم عربی درسگاہ کا خواب دیکھا تھا۔ چنانچہ مکتب سے جامعہ اسلامیہ اور پھر جامعۃ الفلاح بنانے میں آپ کا اہم رول رہا۔ اس کے ابتدائی ادوار میں بھی نظامت کی ذمہ داری آپ ہی کے اوپر تھی اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ جامعہ کے ناظم اور نائب ناظم کی حیثیت سے اب تک سب سے زیادہ ذمہ داری آپ ہی کے کندھوں پر رہی ہے، آپ نے ہمیشہ اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی انجام دینے کی بھرپور کوشش کی ہے اور جامعہ کی تعلیم وترقی کے متعلق ہر وقت فکرمند رہے ہیں۔ اس کی تازہ مثال تعلیمی بیداری کی تازہ مہم ہے جس کے لئے آپ نے گاؤں کے لوگوں کی کئی ایک کارنر میٹنگ کی اور باشندگانِ قریہ کو تعلیم کی طرف توجہ دلائی جس سے اچھا خاصا فائدہ نظر آیا۔

حج کے مبارک سفر پر روانگی سے پہلے صدر جامعہ نے چائے کی ایک نشست میں ڈاکٹر صاحب سے اساتذہ اور کارکنانِ جامعہ کی اجتماعی ملاقات کا نظم کیا۔ اس میں آپ کے ساتھ سابق معتمد مالیات جناب مطیع الرحمٰن صاحب اور حالیہ قائم مقام نائب ناظم اور سابق معتمد مالیات سیٹھ عبدالمتین صاحب بھی موجود تھے۔ اس نشست میں سب سے پہلے مولانا ابوبکر صاحب اصلاحی نے موصوف کا تعارف کراتے ہوئے چند قیمتی کلمات عرض کئے جو بلاکم وکاست پیش خدمت ہیں، اور پھر اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے جو قیمتی نصیحتیں ہم اساتذہ وکارکنانِ جامعہ کو کیں وہ بھی شائع کی جارہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم ان نصیحتوں سے تعلیم وتربیت میں بھرپور فائدہ اٹھا سکیں۔

حمد وثنا کے بعد مولانا ابوبکر صاحب اصلاحی نے فرمایا:

جناب صدر و اساتذہ کرام! مسرت کا مقام ہے کہ جامعہ کے نائب ناظم ڈاکٹر خلیل احمد صاحب حج کے مبارک سفر پر روانہ ہو رہے ہیں اور اس مجلس کے انعقاد کی غرض ڈاکٹر صاحب سے اساتذہ کی اجتماعی ملاقات ہے۔

جامعۃ الفلاح سے ڈاکٹر صاحب کا نہ صرف یہ کہ دیرینہ تعلق ہے بلکہ اس مقام پر جامعہ کے قیام کے پہلے محرک ومجوز آپ ہی ہیں۔ تحریکی ضرورت کے پیش نظر جماعت اسلامی اعظم گڈھ نے یہ فیصلہ کیا کہ اس ضلع میں ایک ایسا دار العلوم قائم کیا جائے جہاں ایسے افراد تیار کئے جائیں جو اعلائے کلمۃ اللہ کے جذبے سے سرشار ہوں اور تحریک کی علمی وفکری رہنمائی کا فریضہ انجام دیں۔ پیش نظر یہ تھا کہ مقام مرکزی ہو جہاں ہر طرف سے آمد ورفت کی سہولتیں ہوں۔ ڈاکٹر صاحب اور یہاں کے بعض اور رفقاء جماعت کی طرف سے یہاں کے لئے پیش کش ہوئی مگر ایک گوشے میں ہونے کی وجہ سے اس طرف میلان نہیں ہوتا تھا چنانچہ مرکزی مقام شہر اعظم گڈھ میں ابتدا کر دی گئی مگر قدرت کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔ یہاں کے لئے ڈاکٹر صاحب کا اصرار جاری رہا۔ پھر کچھ نئے حالات پیدا ہوئے جن کے پیش نظر بالآخر یہ فیصلہ کر ہی دیا گیا کہ مجوزہ دار العلوم اسی مقام پر ہوگا اور اس کا نام جامعۃ الفلاح طے پایا۔

یہاں ابتدا کر دی گئی، کوششیں شروع ہو گئیں۔ مقامی حضرات نے بھرپور تعاون دیا، ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلے میں بنیادی رول ادا کیا۔ پوری دلچسپی اور لگن کے ساتھ اس کی تعمیر وترقی میں لگ گئے۔ ڈاکٹر صاحب، دوسرے کارکنانِ جامعہ اور اساتذہ کرام کے اخلاص اور ان کی جانفشانی سے یہ پودا پروان چڑھا یہاں تک کہ ایک تناور درخت بن گیا اور برگ وبار لا رہا ہے۔

اسی ادارے سے ڈاکٹر صاحب کا جو قلبی وفکری تعلق ہے اس کی بنا پر ہمیں یقین ہے کہ جن مقامات پر دعائیں قبول ہوتی ہیں وہاں پر اپنے اس جامعہ اور متوسلین جامعہ کو ضرور یاد رکھیں گے جامعہ کی ترقی کے لئے دعا کریں گے اور اس بات کی دعا کریں گے کہ اساتذہ کرام تعلیم وتربیت کی ذمہ داری کما حقہ انجام دینے کی توفیق پائیں۔ تاکہ جامعہ کے قیام کا مقصد پورا ہو۔

ڈاکٹر صاحب کا تعلق اس جامعہ سے ابتدا سے ہے اور مسلسل رہا ہے اور اس وقت تو جامعہ کا نظم و انصرام ہی موصوف کے ہاتھوں میں آگیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس دوران ہماری کسی بات، کسی رویے اور طرزِ عمل سے آپ کو تکلیف پہنچی ہو تو ہم عفو و درگزر کی درخواست کرتے ہیں، اور آپ کی وسیع القلبی اور کشادہ ظرفی سے پوری توقع رکھتے ہیں کہ ہمیں ضرور معاف فرمائیں گے۔

آخر میں ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ آپ کے اس سفر کو آپ کے لئے اور آپ کے اہلِ خاندان کے لئے خیر و برکت کا ذریعہ بنائے۔ تمام مناسکِ حج کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور آپ کے حج کو شرفِ قبولیت سے نوازے۔ آمین۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

مولانا کے ان قیمتی کلمات کے بعد محترم ڈاکٹر صاحب اٹھے اور سامعین سے مخاطب ہوئے:

محترم حاضرین! مجھے انتہائی مسرت ہے کہ آپ حضرات سے اجتماعی ملاقات کا یہ زریں موقع نصیب ہو گیا۔ جیسا کہ آپ کے علم میں یہ بات آچکی ہے کہ میں مناسکِ حج کی ادائیگی کے لئے حجازِ مقدس کل روانہ ہونے والا ہوں، میری یہ دلی خواہش تھی کہ آپ تمام ہی حضرات سے فرداً فرداً ملاقات کروں لیکن محترم صدر مدرس صاحب نے اجتماعی ملاقات کا یہ موقع فراہم کر دیا جس کے لئے میں ان کا ممنون ہوں۔

اس موقع پر آپ حضرات سے میری درخواست ہے کہ میرے لئے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ خیر و عافیت کے ساتھ مجھے دیارِ مقدس تک پہنچائے اور بحسن و خوبی مناسکِ حج کی ادائیگی کی توفیق عنایت فرمائے اور شرفِ قبولیت سے نوازے۔ میرے ساتھ میری اہلیہ اور ضعیف نحیف والدِ محترم بھی زیارتِ حرمین کے لئے روانہ ہو رہے ہیں، ان کے لئے بھی خصوصی دعاؤں کی درخواست ہے۔

معزز اساتذہ! جامعہ سے میرا تعلق بڑا دیرینہ ہے اور اپنی بساط کے مطابق مختلف حیثیتوں سے میں اس کی خدمت کرتا رہا ہوں۔ آپ حضرات سے جو میرا ربط و تعلق رہا ہے اس کی وجہ سے بسا اوقات ایسے مواقع آئے ہوں گے جبکہ آپ کو میرے کسی رویئے سے تکلیف پہنچی ہو، اس موقع پر میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں اور مجھے امید ہے کہ فراخدلی کا ثبوت دیتے ہوئے آپ مجھے معاف فرمائیں گے۔

برادرانِ محترم! یہ عظیم ادارہ جس کی خدمت کا شرف ہمیں حاصل ہے، یہ ایک عظیم ملی امانت ہے

جس کی نگہداشت کی بھاری ذمہ داری ہمارے ناتواں کندھوں پر عائد ہوتی ہے۔ یہاں زیرِ تعلیم طلبہ و طالبات امانت کی شکل میں ہمارے پاس ہیں اور ان کی تعلیم و تربیت کی طرف پوری توجہ کئے بغیر عنداللہ ہم اپنی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ ہمیں اس ادارے کی خدمت اس تصور کے ساتھ انجام دینی ہے کہ ہم ایک کارِ عبادت میں مشغول ہیں اور عبادت کی مقبولیت کے لئے اخلاص اور للّٰہیت اوّلین شرط ہے۔ کوئی بازپرس کرنے والا ہو یا نہ ہو ہمیں تو رب العالمین کے سامنے جوابدہی کے احساس کے ساتھ اپنی ذمہ داری ادا کرنی ہے۔ اسلامی مدارس و مکاتب کے اساتذہ و کارکنان کا طرۂ امتیاز ہی خشیتِ الٰہی اور خوفِ آخرت ہے۔ اسی محرک کی وجہ سے انھوں نے اپنے خونِ جگر سے اسلامی دانش گاہوں کی آبیاری کی، اور اسے پروان چڑھایا۔ ہمیں بھی اسی کیفیت کے ساتھ یہاں خدمت انجام دینی ہے۔

معزز اساتذہ! یہ ادارہ عام اداروں کی طرح کا کوئی روایتی مدرسہ نہیں ہے بلکہ اپنے مقاصد، خصوصیات اور نصابِ تعلیم و تربیت کے اعتبار سے اپنی نوعیت کا ایک منفرد ادارہ ہے جس کا اولین و بنیادی مقصد ایسے افراد کی تیاری ہے جو احیائے دین کے جذبہ سے سرشار ہوں اور شہادتِ حق کے فریضے کی ادائیگی کے لئے ہر طرح سے تیار ہوں۔ ظاہر ہے اگر ہم کارکنان و اساتذہ پر جذبۂ احیائے دین کا پورے طور سے غلبہ نہ ہو، ہماری عملی زندگی فریضۂ شہادتِ حق کی ادائیگی کی مجسم تصویر نہ ہو اور تحریکِ اسلامی کے عظیم کاز میں ہماری پوری ذہنی شمولیت نہ ہو تو ہم اپنے زیرِ تربیت طلبہ کے اندر یہ صفات کیونکر پیدا کر سکتے ہیں۔ اس حیثیت سے ہمیں بار بار اپنا احتساب کرتے رہنا چاہئے۔

برادرانِ محترم! تعلیم و تربیت کے عمل میں بنیادی کردار اساتذہ ہی کا ہوتا ہے۔ استاذ و شاگرد کے درمیان جو رشتہ ہے وہ ایک پاکیزہ روحانی رشتہ ہے، اور اس رشتہ کی استواری کے بغیر تعلیم و تربیت کے میدان میں کامیابی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ پاکیزہ روحانی رشتہ مہر و محبت اور لطف و شفقت سے قائم، مضبوط اور استوار ہوتا ہے۔ اساتذہ اگر اپنے طلبہ سے غیر معمولی محبت کریں، ان سے مخلصانہ و مشفقانہ تعلقات رکھیں، دلسوزی کے ساتھ ان کے اخلاق کی تعمیر میں حصہ لیں، اور ان کی ضروریات و مسائل کا بھی خیال رکھیں تو طلبہ کے دل میں بھی اپنے اساتذہ کے لئے بے پناہ جذبۂ عقیدت و محبت پیدا ہوتا ہے اور باپ بیٹے کا وہ پاکیزہ روحانی رشتہ قائم

جو طلبہ کو افادہ اور استفادہ کے لئے سازگار فضا و ماحول پیدا کرتا ہے۔ معلّمِ انسانیت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شخصیت میں جو غیر معمولی کشش تھی اس کا سبب اللہ تعالیٰ نے آپ کی صفت رأفت و رحمت و الفت و محبت ہی کو قرار دیا ہے۔ تجربہ اس بات پر شاہد ہے کہ نرمی و محبت کی وجہ سے شخصیت اگر پرکشش بنتی ہے تو درشتی اور سختی دوری اور تنفر کا سبب بنتی ہے۔ ہمیں طلبہ کے لئے اپنی شخصیت کو پرکشش بنانے کے لئے ہادیٔ اعظم ؐ کے اسوۂ حسنہ کے مطابق الفت و محبت کا پیکر بننا ہوگا۔

آخر میں ایک مخلصانہ مشورہ یہ بھی میں دے دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ حضرات اپنے علمی ارتقاء کی طرف برابر متوجہ رہیں اور مطالعہ و مذاکرہ کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھیں۔ آپ حضرات کو تصنیف و تالیف کا اہم کام بھی انجام دیتے رہنا چاہئے تاکہ آپ کے علم و تجربہ سے زیادہ وسیع حلقہ میں استفادہ ہو سکے۔ آپ کے فارغ اوقات کا میری سمجھ سے بہترین مصرف یہی ہے کہ آپ اسے تصنیف و تالیف کے کام میں لگائیں۔ ہم آئندہ جامعہ میں ایسے منصوبے زیر عمل لانے کی کوشش کریں گے جن کے ذریعہ علمی کاموں کی ہر طرح سے ہمت افزائی ہو اور جامعہ میں بہترین علمی فضا تیار ہو سکے۔

مجھے توقع ہے جس خلوص کے ساتھ میں نے چند معروضات آپ کی خدمت میں رکھی ہیں اسی اپنائیت کے ساتھ آپ ان پر غور کرنے کی زحمت گوارا کریں گے۔ میں آپ حضرات سے پھر ایک بار دعاؤں کی درخواست کرتا ہوں اور ان شاء اللہ میں بھی آپ تمام ہی حضرات کے لئے مقدس مقامات میں دعائیں کروں گا۔

والسلام۔ خلیل احمد